www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

March 2009 • No. 388

دریا کا پانی نہ کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے کی طرف مڑتا ہے۔ وہ مسلسل اور ہر آن اپنی منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 250
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

الرسالہ

مارچ 2009

حقیقی محبت، اضافی محبت 2
معرفت اور وحدتِ وجود 3
حفاظتِ خداوندی 4
آدابِ کلام 5
پیغمبر کا اُسوہ 6
مسرت اور قناعت 8
جنّتی شخصیت 10
دنیا کی حقیقت 11
علماء کم، خطباء زیادہ 12
جب اسلام اجنبی بن جائے 13
شخصیت کی تعمیر 14
قرآن سے رہ نمائی 15
انسانی اَقدار 16
فائنل توجیہہ 17
دردناک انجام 18
شکرِ خداوندی 19
جہاد، قتال 20
اللہ اکبر کی اسپرٹ 21
نیا انسان 22
غلط فہمی سے بچئے 23
ٹیم ورک کی اہمیت 24
پیغمبر کا طریقہ 26
فارمل ایجوکیشن، اِنفارمل ایجوکیشن 27
خوش فکری، یا حقیقت پسندی 28
بچوں کا دکھ جھیل رہے ہیں 29
دعوت کے عمومی مواقع 30
آگ کی طرف چھلانگ 32
محدودیت میں جینا 34
جدید تہذیب کا بگاڑ 35
تاریخِ عالم پر ایک تبصرہ 36
حقیقت پسندی، معیار پسندی 37
چُپ کی طاقت 38
اخراجات کو گھٹایئے 39
مسئلے کا یقینی حل 40
سوال و جواب 41
خبر نامہ اسلامی مرکز 45

حقیقی محبت، اضافی محبت

قرآن کی سورہ نمبر 2 میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے (والّذین اٰمنوا أشد حبّاً لله۔ البقرة: 165) خدا سے محبت کا مطلب کیا ہے۔ علماء عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ خدا سے محبت کا مطلب خدا کی اطاعت ہے۔ اِس کے مقابلے میں، صوفیا کا یہ کہنا ہے کہ خدا سے محبت کا مطلب خدا سے عشق ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں قرآن کی آیت کی صحیح تشریح نہیں۔

محبت دراصل قلبی تعلق کا نام ہے۔ گہری قلبی کیفیت کے ساتھ جب آپ کو کسی سے غیر معمولی تعلق قائم ہو جائے تو اسی کا نام محبت ہے۔ اِس پہلو سے، صرف خدائے واحد اِس کا مستحق ہے کہ ایک بندہ اُس سے شدید محبت کرے۔ خدا کی نسبت سے محبت، خدا کی نعمتوں کے اعلیٰ اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ اِس قسم کی محبت کا حق بلاشبہہ صرف خدا کو ہے، اُس کے سوا کسی اور کو نہیں۔

محبت کی دو قسمیں ہیں— حقیقی محبت (real love)، اور اِضافی محبت (relative love)۔ دنیا کی زندگی میں مختلف اسباب سے ایک انسان کو دوسرے انسان سے محبت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، حتی کہ ایک گھر اور ایک حیوان سے بھی۔ لیکن اِس قسم کی محبتیں انسان کے مرتے ہی فوراً ختم ہو جاتی ہیں۔ اِس لیے اِس قسم کی تمام محبتیں اضافی محبتیں ہیں۔ وہ وقتی اسباب سے پیدا ہوتی ہیں اور اسباب کے ختم ہوتے ہی وہ اچانک ختم ہو جاتی ہیں۔ اِس کے مقابلے میں، خدا کی محبت حقیقی محبت ہے۔ وہ حقیقی اسباب سے پیدا ہوتی ہے اور جب وہ کسی انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ ابدی طور پر باقی رہتی ہے، موت اُس کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ خدا نے انسان کو وجود بخشا، خدا نے انسان کو اِس دنیا میں رہنے کے لیے ایک بے حد موافق زمین دی، خدا نے انسان کے لیے اعلیٰ درجے کا لائف سپورٹ سسٹم قائم کیا، اِس طرح کی ان گنت چیزیں جو اِس دنیا میں انسان کو ملی ہوئی ہیں، ان کو دینے والا صرف خدا ہے، کوئی بھی دوسرا شخص اِن عطیات میں خدا کا شریک نہیں۔ یہ احساس جب کامل اعتراف میں ڈھل جائے تو اِسی کا نام محبتِ خداوندی ہے۔

معرفت اور وحدتِ وجود

معرفت اِس دنیا کی سب سے بڑی یافت ہے۔ مگر میرا احساس ہے کہ پوری تاریخ میں معرفت کے بارے میں لوگوں کو ایک شدید مغالطہ ہوا ہے۔ انسان کو جب اعلیٰ معرفت حاصل ہوتی ہے، تو یہ اُس کے لیے ایک ناقابلِ بیان تجربہ ہوتا ہے۔ انسانی زبان میں اس کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ اِس معرفت کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خدا کے اتنا قریب آ گیا ہے جیسے کہ اس کی ہستی خدا کی ہستی میں شامل ہوگئی ہے۔

تاہم یہ تمام تر ایک نفسیاتی تجربہ ہوتا ہے۔ لوگوں نے شدید غلط فہمی کی بنا پر اِس تجربہ کو وجودی قربت (physical nearness)، یا وجودی اتحاد (physical emergence) کے معنٰی میں لے لیا۔ اِسی سے وحدتِ وجود (monism) کا نظریہ پیدا ہوا۔ نفسیاتی قربت کی حد تک یہ حقیقتِ اعلیٰ کے ادراک کی بات تھی، لیکن وحدتِ وجود کے نظریے کی صورت میں وہ سرتاپا ایک باطل چیز بن گئی۔ اِس مشکل کو حل کرنے کے لیے شیخ احمد سرہندی نے وحدتِ شہود کا نظریہ ایجاد کیا۔ اِسی طرح ابنِ عربی نے کہا:

العبدُ عبدٌ، وإن ترقّی والربُّ ربٌّ، وإن تنزّل

مگر میرے نزدیک، یہ دونوں باتیں صرف کنفیوژن (confusion) کا کیس ہیں، وہ اصل معاملے کی حقیقی توضیح نہیں۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ خدا نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کی فطرت میں ربانی شعور پیوست کر دیا ہے۔ وہ انسان کے لاشعور میں مسلسل موجود رہتا ہے۔ اِسی لاشعور کو شعور میں لانے کا نام معرفت ہے۔ یہ صرف ایک دریافت ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی بھی قسم کی کوئی مماثلت نہیں۔ معرفت کا معاملہ تمام تر دریافت کا معاملہ ہے۔ معرفت ایک خارجی حقیقت کی شعوری دریافت ہے۔ تاہم یہ دریافت سائنسی دریافت کی طرح محض ایک ٹکنکل دریافت نہیں۔ یہ دریافت آدمی کو حقیقت کے سمندر میں غرق کر دیتی ہے۔ اِسی نفسیاتی معاملے کی غلط توجیہہ کے نتیجے میں وحدتِ وجود (monism) یا ادوئت واد کا نظریہ پیدا ہوا۔

حفاظتِ خداوندی

فتحِ مکہ (8 ہجری) سے پہلے مدینہ کے حالات اچھے نہ تھے۔ چناں چہ رات کے وقت صحابہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہرہ داری کرتے تھے۔ ایک رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قبہ سے اپنا سر باہر نکالا اور کہا: **انصرفوا أيها الناس، فقد عصمني الله** (الترمذی، کتاب التفسیر) یعنی اے لوگو، واپس جاؤ۔ اللہ نے میری حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات قرآن کی ایک آیت کی بنیاد پر فرمائی تھی جو غالباً اُسی رات کو اتری تھی۔ وہ آیت یہ ہے: **يا أيها الرسول بلّغ ما أنزل إليك من ربّك، وإن لم تفعل فما بلّغتَ رسالته، والله يعصمك من الناس** (المائدة: 67) یعنی اے پیغمبر، جو کچھ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے اترا ہے، تم اُس کو پہنچاؤ۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ لوگوں سے تمھاری حفاظت کرے گا۔

قرآن کی اِس آیت کے مطابق، 'عصمت من الناس' کا راز 'تبلیغ ما انزل اللہ' میں چھپا ہوا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ یہ وعدہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شخصی طور پر نہ تھا، یہ آپ کی امت کے ہر اُس فرد یا اُس گروہ کے بارے میں ہے جو خالص پیغمبرانہ نمونے کے مطابق، دعوت اور تبلیغ کا کام کرے۔ سچے داعیوں کے لیے یہ ایک ابدی وعدہ ہے، وہ کسی خاص زمانے تک محدود نہیں۔

دعوتِ حق کے کام کو قرآن میں اللہ تعالیٰ کی نصرت بتایا گیا ہے (الصف: 14) اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو یہ کام کرے گا، اُس کو ضرور خدا کی مدد حاصل ہوگی (محمد: 7)۔ یہ امتِ محمدی کے لیے ابدی طور پر ایک رہ نما ہدایت ہے۔ افرادِ امت کو چاہیے کہ وہ اپنے عمل کی منصوبہ بندی، مسائلِ دنیا کی بنیاد پر نہ کریں، بلکہ دعوت الی اللہ کی بنیاد پر کریں۔ دعوت کی ذمے داری ادا کرنے کے بعد ایسے حالات پیدا ہوں گے کہ اُن کے دنیوی مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ اِس کے برعکس، اگر انھوں نے دنیوی مسائل کو اپنے عمل کا نشانہ بنایا، تو دونوں میں سے کوئی بھی چیز اُن کو ملنے والی نہیں۔

آدابِ کلام

مکی دور میں جب قرآن اترنا شروع ہوا تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ اُس زمانے میں ایسا ہوا کہ فرشتہ جبریل، قرآن کا کوئی حصہ لے کر آئے اور انھوں نے اس کو آپ کے سامنے پڑھا۔ اُس وقت آپ نے یہ کیا کہ آپ سنے ہوئے الفاظ کو درمیان میں دہرانے لگے، تاکہ آپ اُس کو بھول نہ جائیں۔ قرآن کی سورہ نمبر 75 میں اِس پر یہ ممانعت اتری: **لا تحرك به لسانك لتعجل به ۔ إن علينا جمعه وقرآنه، فإذا قرأناه فاتّبع قرانه** (القیامة: 16-18) یعنی تم اس کے پڑھنے پر اپنی زبان حرکت میں نہ لاؤ، تاکہ تم اُس کو جلدی سیکھ لو۔ ہمارے اوپر ہے، اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا۔ پس جب ہم اس کو سنائیں، تو تم اس کے سنانے کی پیروی کرو۔

قرآن کی اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، اُس کا تعلق صرف پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جبریل اِس بات کو الگ سے پیغمبر اسلام کو بتا دیتے۔ قرآن میں یہ بات اس لیے شامل کی گئی، تاکہ اِس کے ذریعے دوسرے لوگوں کو آدابِ کلام کی تعلیم دی جا سکے۔ اِس اعتبار سے، قرآن کی اِس آیت کا تعلق عمومی طور پر آدابِ کلام سے ہے، نہ کہ صرف پیغمبر اسلام کی ذات سے۔

اِس آیت سے کلام کا صحیح طریقہ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب کوئی شخص ایک بات کہے، تو دوسرا آدمی پوری طرح خاموش ہو کر اُس کی بات کو سنے۔ سننے والے کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ بیچ میں بولنے لگے۔

اکثر لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ گفتگو کے دوران بیچ میں بار بار بولتے ہیں۔ یہ طریقہ آدابِ کلام کے خلاف ہے۔ نیز اُس کا یہ نقصان ہے کہ سننے والا، کہنے والے کی بات کو پوری طرح نہ پکڑے۔ اِس طرح گفتگو کا اصل فائدہ حاصل نہ ہو۔ باہمی گفتگو کا مقصد اِفہام وتفہیم، یا ڈائلاگ اور لرننگ (learning) ہوتا ہے۔ گفتگو کے دوران بولنے سے یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اِس کا فائدہ نہ سننے والے کو ملتا ہے اور نہ کہنے والے کو۔

پیغمبر کا اُسوہ

قرآن کی سورہ نمبر 12 میں حضرت یوسف کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اِس قصے کو قرآن میں احسن القصص (یوسف: 2) کہا گیا ہے۔ اِس قصے کے 'احسن القصص' ہونے کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں، لیکن اُس کا ایک پہلو، حضرت یوسف کا وہ طریقِ کار (method) ہے جو انھوں نے بادشاہِ وقت کے معاملے میں اختیار کیا۔ اِس طریقِ معاملہ کو قرآن میں اس طرح بتایا گیا ہے کہ بادشاہِ مصر نے حضرت یوسف کی شخصی صلاحیت سے متاثر ہو کر اُن سے کہا کہ تم کو میری سلطنت کے خزائن (یوسف: 55) پر اختیار ہوگا، تاہم جہاں تک ملک کے قانونی نظام کا تعلق ہے، اُس میں حسبِ سابق، بادشاہ کا قانون جاری رہے گا۔ اِسی بات کو بائبل میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

اور فرعون (شاہِ مصر) نے یوسف سے کہا: چوں کہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے، اِس لیے تیری مانند دانش ور اور عقل مند کوئی نہیں۔ سو، تو میرے گھر کا مختار ہوگا، اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا:

Then Pharaoh said to Joseph, "Inasmuch as God has shown you all this, there is no one as discerning and wise as you. You shall be over my house, and all my people shall be ruled according to your word; only in regard to the throne, will I be greater than you". (Genesis 41:39-40)

حضرت یوسف کے زمانے میں مصر کا جو بادشاہ تھا، وہ ایک حقیقت پسند آدمی تھا۔ عام بادشاہوں کی طرف وہ جارحانہ مزاج کا انسان نہ تھا۔ چناں چہ وہ راضی ہو گیا کہ تخت کا مالک میں رہوں، لیکن اُمورِ سلطنت کو حضرت یوسف انجام دیں۔ حضرت یوسف نے بادشاہ کی اِس پیش کش کو قبول کر لیا۔ بادشاہ کے برائے نام اقتدار کے تحت، وہ اپنا پیغمبرانہ مشن چلاتے رہے۔

قرآن کے مطابق، ہر پیغمبر کا عمل ہمارے لیے یکساں طور پر درست نمونے کی حیثیت رکھتا ہے (الأنعام: 90)۔ اِس بنا پر حضرت یوسف کا نمونہ بھی ہمارے لیے اتنا ہی قابلِ اتّباع ہے، جتنا کہ

پیغمبر اسلام یا اور کسی پیغمبر کا نمونہ۔ یہ نمونہ اِس اصول پر مبنی ہے کہ اگر سیاسی حاکم اصل مشن میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالے تو اُس سے ٹکراؤ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اُس کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کے تحت، اپنے مثبت اور تعمیری کام کی منصوبہ بندی (planning) کی جائے گی۔

حضرت یوسف کو یہ موقع اِس لیے ملا تھا کہ ان کا مُعاصر بادشاہ حقیقت پسند آدمی تھا۔ موجودہ زمانے میں اب یہ معاملہ کسی کے شخصی مزاج کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ یوسفی اصول اب عالمی طور پر تسلیم شدہ اصول (universally accepted principle) کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

اب اس دورِ آزادی میں تمام حکم رانوں نے یہ مان لیا ہے کہ وہ اپنے مخصوص سیاسی دائرے کے باہر کسی معاملے میں تعرّض نہیں کریں گے۔ لوگوں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ جس طرح چاہیں، اپنے امور کی تنظیم کریں، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ وہ دوسروں کے خلاف تشدد کا کوئی فعل نہیں کریں گے۔

حضرت یوسف کے زمانے میں جو چیز استثنائی موقع کی حیثیت رکھتی تھی، وہ اب عمومی موقع کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ اِس موقع کو دعوتِ حق کے لیے استعمال کرنا، پیغمبر کے طریقے کی پیروی ہے۔ اور اِس کے خلاف عمل کرنا، پیغمبر کے طریقے سے انحراف (deviation) کے ہم معنیٰ ہے۔

مذکورہ یوسفی اُسوہ کی مثال خود پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں موجود ہے۔ پیغمبر اسلام اپنی نبوت کے ابتدائی زمانے میں جب مکہ میں تھے تو اُس وقت آپ کو مکہ میں سیاسی اقتدار حاصل نہ تھا۔ مکہ کے قبائلی پارلیامنٹ دارالندوہ میں مشرک قبائل کو غلبہ حاصل تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے دارالندوہ پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مکہ میں سیاسی اقتدار یا دارالندوہ پر قبضہ کیے بغیر دعوت کے جو مواقع آپ کو حاصل تھے، اس کو آپ استعمال کرتے رہے۔ مزید یہ کہ اُس زمانے میں مشرکین کی طرف سے آپ کو اقتدار کی پیش کش کی گئی، لیکن آپ نے اس کو قبول نہیں کیا اور فرمایا: **ما أطلب الملك عليكم**۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت پر قبضے کے بغیر اگر مجھے دعوتی مواقع حاصل ہیں تو وہی میرے لیے کافی ہیں، مجھے تمھارے اوپر حاکم بننے کی ضرورت نہیں۔

مسرت اور قناعت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صرف خدا کی یاد سے انسان کو اطمنانِ قلب حاصل ہوتا ہے (الرعد: 28)۔ حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اللھم لا عیش إلا عیش الآخرۃ** (صحیح البخاری، کتاب الرّقاق) یعنی پُر مسرّت زندگی صرف آخرت میں حاصل ہوسکتی ہے۔

قرآن اور حدیث کے اِن دونوں حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسرت (happiness) اور اطمنان، دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں، موجودہ دنیا میں کسی کو اطمنانِ قلب تو حاصل ہوسکتا ہے، لیکن مادّی معنوں میں پر مسرت زندگی کا حصول یہاں ممکن نہیں۔ مسرت کا تعلق، مادی راحت کی چیزوں سے ہے۔ اِس کے مقابلے میں، اطمنان ایک ذہنی حالت کا نام ہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں کسی کو وہ تمام مادی ساز وسامان نہیں مل سکتا جس کو پر مسرت زندگی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے، البتہ ذہنی اعتبار سے اُس داخلی کیفیت کا حصول ممکن ہے جس کو اطمنان کہا گیا ہے۔

مادّی ساز وسامان کا بقدر شوق ملنا، اِس لیے ممکن نہیں کہ موجودہ دنیا اِس مقصد کے لیے نہیں بنائی گئی ہے۔ موجودہ دنیا امتحان اور آزمائش کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں وہی سامان اکھٹا کیے گئے ہیں جو امتحان کی مصلحت کے اعتبار سے ضروری ہیں۔ اِس لیے موجودہ دنیا میں پر مسرت زندگی کی تعمیر ایک ایسا کام ہے جس کی گنجائش خالق کے تخلیقی پلان میں نہیں، اور جو چیز خالق کے تخلیقی پلان میں نہ ہو، اُس کا حصول موجودہ دنیا میں کبھی ممکن نہیں ہوسکتا۔

اطمنانِ قلب کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ اطمنانِ قلب کے حصول کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ آدمی ملی ہوئی صورتِ حال پر راضی ہوجائے۔ اِسی کا نام قناعت (content) ہے۔ اگر آدمی کے اندر قناعت کا مزاج پیدا ہوجائے، تو کسی بھی حال میں، وہ کامل اعتدال کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔ اِسی لیے حدیث میں مومن کی مثال مسافر سے دی گئی ہے (**کُن فی الدنیا کأنّك غریب، أوعابرُ سبیل۔ صحیح البخاری، کتاب الرقاق**)۔

مسافر اپنے آپ کو سفر کی حالت میں سمجھتا ہے، اِس لیے وہ سفر کے وقت، یا سواری میں بیٹھ کر اطمنان کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کو پیشگی طور پر یہ معلوم رہتا ہے کہ سفر میں اس کو گھر جیسا آرام نہیں مل سکتا۔ مسافر آدمی جب ایک سواری میں بیٹھا ہو، تو وہ یہ امید نہیں رکھتا کہ اس کو گھر والی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔ یہی سوچ آدمی کو سفر میں مطمئن رکھتی ہے۔ اِس کے برعکس، اگر وہ سواری کے اندر گھر والی سہولتوں کی امید رکھے، تو وہ پورے سفر میں پریشانیوں سے دوچار رہے گا۔ اِسی حقیقت پسندانہ سوچ کا نام قناعت ہے، اور قناعت کی سوچ ہی اِس دنیا میں اطمنان کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

موجودہ زمانے میں ایک مسئلہ بہت زیادہ عام ہے۔ اِس مسئلے کو اسٹریس (stress) یا ٹنشن (tension) کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں ایسے ادارے کھُلے ہوئے ہیں جو ڈی اسٹریسنگ (de-stressing) کے نام پر بڑے بڑے بزنس چلا رہے ہیں، مگر ڈی اسٹریسنگ کا یہ پورا کام صرف مسئلہ (problem) کے نام پر تجارت کرنا ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں مسئلے کو حل کرنا۔

ڈی اسٹریسنگ کا واحد ممکن ذریعہ قناعت (content) ہے۔ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی صورتِ موجودہ پر دل سے راضی ہو جائے۔ اور صورتِ موجودہ پر دل سے راضی ہو جانا ہی آدمی کو اِس دنیا میں اطمنان اور سکون کی زندگی عطا کر سکتا ہے۔ اِس کے سوا، اِس دنیا میں اطمنان اور سکون کے حاصل کرنے کا اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

دعوت الی اللہ کا کام کرنے والے حضرات اِس مقصد کے لیے اردو، ہندی اور انگریزی پمفلٹس مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ اِس کے لیے ضروری ہوگا کہ حسب ذیل پتہ پر ایک درخواست لکھ کر روانہ کی جائے۔ پتہ مع پن کوڈ انگریزی میں مطلوب ہوگا:

CPS International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi - 110 013,
Mob. 91-9810558483, Fax: 91-11-24357333,
email: info@cpsglobal.org

جنّتی شخصیت

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **یدخل الجنّة أقوامٌ أفئدتهم مثل أفئدةِ الطّیر** (صحیح مسلم، کتاب الجنة؛ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 331) یعنی جنت میں ایسے لوگ جائیں گے جن کے دل چڑیوں کے دل کی مانند ہوں۔

چڑیا ایک حیوان ہے، مگر چڑیا کے اندر ایک ایسی استثنائی صفت ہوتی ہے جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں، وہ یہ کہ چڑیا نفرت اور انتقام (revenge) کے جذبات سے خالی ہوتی ہے۔ تمام دوسرے جانور دفاعی طور پر حملہ کرنے کا مزاج رکھتے ہیں، لیکن چڑیا اِس مزاج سے مکمل طور پر خالی ہوتی ہے۔ آپ چڑیا کو دیکھئے تو وہ اپنی شکل ہی سے معصومیت کا پیکر دکھائی دے گی۔ اِس لیے کبوتر (pigeon) کو امن کی علامت (symbol of peace) قرار دیا گیا ہے۔

حدیث کے مطابق، یہی جنّتی صفت اُس انسان سے مطلوب ہے جو جنت کا طالب ہو۔ جنتی انسان وہ ہے جو ہر قسم کے منفی جذبات سے مکمل طور پر خالی ہو، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ چڑیا کے اندر یہ مثبت صفت جبلّت (instinct) کے طور پر ہوتی ہے اور جنتی انسان کے اندر یہ مثبت صفت آزادانہ شعور کے تحت۔

جنّتی انسان وہ ہے جو اپنی تربیت کرکے اپنے آپ کو ایسا بنائے کہ اس کا دل نفرت اور انتقام جیسی چیزوں سے مکمل طور پر خالی ہو جائے، جو غصے کو پی جانے والا ہو، جو منفی ردّعمل کا مزاج نہ رکھتا ہو، جو نفرت کے باوجود محبت کرنے والا انسان ہو، جو کسی امید کے بغیر لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، جو لوگوں کے درمیان اِس طرح رہے، جیسے کہ سب لوگ اُس کے بھائی اور بہن ہیں، جو شیطان سے بھاگے اور فرشتوں کو اپنا ہم نشین بنائے، جو شکایتوں کو صبر کے خانے میں ڈال دے، جو دوسروں کا حق ادا کرے اور اپنا حق خدا سے مانگے — یہی وہ اعلیٰ صفات ہیں جو کسی انسان کو جنت میں داخلے کا مستحق بنائیں گی۔

دنیا کی حقیقت

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الدنیا ملعونۃٌ، ملعونٌ ما فیھا إلّا ذکر اللہ، وما والاہ، وعالماً ومتعلما** (ابن ماجہ، کتاب الزّھد؛ الترمذی، کتاب الزھد) یعنی دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا کے اندر ہے، وہ سب ملعون ہے، سوا ذکر اللہ کے اور وہ چیز جو اُس کے قریب ہو، اور عالم اور طالبِ علم۔

دنیا اور ذکر اللہ دونوں ایک دوسرے الگ نہیں ہیں۔ یادِ الٰہی کے لیے دنیا کو پوائنٹ آف ریفرنس بنالینا، یہی وہ چیز ہے جس کو اِس حدیث میں ذکر اللہ کہا گیا ہے۔ اگر یہ یاد اللہ کے نام کے ساتھ ہو تو وہ براہِ راست ذکر ہے۔ اور اگر نام کے بغیر اللہ کو یاد کیا جائے تو وہ بالواسطہ ذکر۔ اِسی طرح، وہ عالم اور وہ طالبِ علم خدا کے نزدیک مطلوب عالم اور طالبِ علم ہیں جو اپنے علم کو ذکرِ الٰہی کا ذریعہ بنائیں۔

دنیا یا دنیا کی چیزوں کا خالق بھی اللہ ہے۔ اِس لیے دنیا فی نفسہٖ ملعون نہیں ہوسکتی۔ یہ دراصل دنیا کا استعمال ہے جو اس کو ملعون یا غیر ملعون بناتا ہے۔ جو شخص دنیا کو پا کر خدا کو بھول جائے، اس کے لیے دنیا ملعون کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جس شخص کے لیے دنیا کو پانا یادِ الٰہی کا ذریعہ بن جائے، اُس کے لیے دنیا رحمت اور سعادت کی چیز ثابت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا آزمائش (test) کے لیے بنائی گئی ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں آزمائشی پرچے (test papers) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ پرچے اِس لیے ہیں، تاکہ ناکام ہونے والوں اور کامیاب ہونے والوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔

جس شخص نے دنیا کی چیزوں سے یادِ خداوندی کی غذا لی وہ اِس آزمائش میں کامیاب ہوا۔ اِس کے برعکس، جس آدمی کے لیے دنیا کی چیزیں خالق سے دوری اور فراموشی کا سبب بن گئیں، وہی وہ انسان ہے جو آزمائش میں ناکام ہوگیا۔ اِس طرح، دنیا بہ اعتبارِ استعمال، کسی کے لیے ذریعۂ لعنت ہے اور کسی کے لیے ذریعۂ رحمت۔

علماء کم، خطباء زیادہ

مشہور صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: إنكم في زمانٍ كثيرٌ علماؤه، قليلٌ خطباؤه، وإن بعدكم زمانا كثيرٌ خطباؤه، والعلماء فيه قليل (رواه البخاري في الأدب المفرد) یعنی آج تم ایک ایسے زمانے میں ہو، جب کہ امت میں علماء بہت ہیں اور خطباء کم ہیں۔ تمھارے بعد ایک ایسا زمانہ آئے گا، جب کہ امت میں خطباء زیادہ ہوں گے اور علماء کم ہوں گے۔

اِس قول میں علماء سے مراد حقیقی اہلِ علم ہیں، اور خطباء سے مراد عوامی انداز میں بولنے والے مقررین ہیں۔ بعد کے زمانے سے مراد اسٹیج اور میڈیا کا زمانہ ہے۔

یہ بعد کا زمانہ آج پوری طرح ہمارے سامنے آچکا ہے۔ قدیم زمانے میں، جب کہ پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا وجود میں نہیں آیا تھا اور نہ جدید قسم کا اسٹیج بنا تھا، اُس وقت تقریر و خطابت میں کوئی کشش موجود نہ تھی۔ اُس وقت کے حالات میں لوگ زیادہ تر علمی مطالعہ اور علمی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ اِس بنا پر قدیم زمانے میں یہ ممکن تھا کہ بڑے بڑے اہلِ علم پیدا ہوں۔

موجودہ زمانے میں، اسٹیج اور میڈیا کے ظہور نے صورتِ حال کو بالکل بدل دیا ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آدمی پُر جوش تقریریں کر کے اسٹیج پر نمایاں ہو۔ اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں۔ ٹی وی کے پروگراموں میں اس کا شان دار مظاہرہ ہو، وغیرہ۔

اِس طرح کی چیزوں نے آج کے ذہین لوگوں کو علم سے بے رغبت کر دیا ہے۔ اسٹیج اور میڈیا میں نمایاں ہونا، اُن کے لیے زیادہ پرکشش بن گیا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو صحابیٔ رسول نے پیشین گوئی کے انداز میں بیان کیا۔

علم والا آدمی سوچ کر بولتا ہے اور خطابت والا آدمی سوچے سمجھے بغیر اپنی تقریر شروع کر دیتا ہے۔ اِس فرق کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ علم والا آدمی مُصلح کا درجہ پاتا ہے، اور خطابت والا آدمی مفسد کا درجہ۔ مستقبل کی تعمیر کے لیے، ہمیشہ اہلِ علم درکار ہوتے ہیں، نہ کہ اہلِ خطابت۔

جب اسلام اجنبی بن جائے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **بدأ الإسلام غريباً وسيعود كما بدأ (صحيح مسلم، كتاب الإيمان)** یعنی اسلام شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ بعد کے زمانے میں اسلام دوبارہ اجنبی ہو جائے گا۔

اِس معاملے کی ایک مثال حکمتِ حُدیبیہ ہے۔ قرآن میں حکمتِ حدیبیہ کو فتحِ مبین (الفتح: 1) کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ مگر دورِ نبوت کے بعد دوبارہ حکمتِ حدیبیہ کو دہرایا نہیں گیا، پوری مسلم تاریخ حکمتِ حدیبیہ کی دوسری مثال سے خالی ہے۔ حدیث کے مطابق، اِس کا سبب یہ ہے کہ اسلام خود مسلمانوں کے درمیان اجنبی ہو کر رہ گیا۔

حکمتِ حدیبیہ کیا ہے۔ حکمتِ حدیبیہ یہ ہے کہ مخالفین سے یک طرفہ صلح کر کے حالات کو معتدل بنانا اور پھر مواقع (opportunities) کو اپنے حق میں استعمال کرنا۔ یہ بلاشبہہ ایک فاتحانہ حکمت ہے۔ مگر اِس فاتحانہ حکمت کو استعمال کرنے کے لیے آدمی کو پیچھے ہٹنا پڑتا ہے، بظاہر وقتی ہزیمت کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اپنے جذبات کو دبا کر خالص عقلی فیصلہ لینا پڑتا ہے، اِس بنا پر حکمتِ حدیبیہ کو اختیار کرنا ایک قربانی کا عمل بن جاتا ہے۔ لوگ اِس قربانی کو دے نہیں پاتے، اِس لیے وہ حکمت حدیبیہ کو استعمال بھی نہیں کر پاتے۔

موجودہ زمانے میں لوگ حکمتِ حدیبیہ سے اتنے زیادہ بے خبر ہو چکے ہیں کہ اگر آج حکمتِ حدیبیہ کی بات کی جائے تو لوگ اس کو بزدلی اور پسپائی کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لوگوں کی اِسی بے خبری کا نتیجہ ہے کہ حدیبیہ جیسا فتحِ مبین کا واقعہ تاریخ میں دوبارہ دہرایا نہ جا سکا۔ لوگ غیر ضروری طور پر لڑ کر اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔ حالاں کہ عین اُسی وقت، حکمتِ حدیبیہ اُن کے لیے زندگی کا پیغام دے رہی ہے۔ فتحِ مبین کا امکان ہوتے ہوئے، وہ شکستِ مبین کو قبول کیے ہوئے ہیں— کیسے عجیب ہوں گے وہ مسلمان جن کے درمیان خود اسلام اجنبی ہو کر رہ جائے۔

شخصیت کی تعمیر

موجودہ زمانے میں ہر آدمی کیریر پرسن (career person) بنا ہوا ہے۔ ہر آدمی یہ کر رہا ہے کہ وہ اپنے لیے ایک کیریر کو چنتا ہے۔ مثلاً انجینئر، ڈاکٹر، وکیل، ٹیچر، بزنس مینیجر، وغیرہ۔ ہر آدمی یہ کر رہا ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ کیریر کے مطابق، تعلیم حاصل کرتا ہے۔ وہ اس کی ٹریننگ لیتا ہے اور پھر اس کے مطابق، جاب (job) حاصل کرکے، اپنی پوری زندگی اُس میں لگا دیتا ہے۔ ہر عورت اور مرد کیریرازم (careerism) کے اِس طریقے پر چلتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مرکر اِس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

یہ دنیوی معنیٰ میں شخصیت کی تعمیر ہے۔ اِسی طرح، آخرت کے اعتبار سے بھی یہ مطلوب ہے کہ ہر آدمی اپنے اندر وہ شخصیت بنائے جو آخرت کی دنیا میں کام آنے والی ہو۔

اِس دوسری قسم کی شخصیت کی خصوصیات کیا ہیں۔ ایسے انسان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زندگی کا آغاز تلاشِ حق (truth seeking) سے ہوا ہو، اور پھر ذاتی جستجو کے ذریعے وہ حقیقت اعلیٰ کو دریافت کرلے۔ ایسی شخصیت کو ربانی شخصیت کہا جاسکتا ہے۔ حقیقت کی دریافت ہی ربانی شخصیت کی تعمیر کا آغاز ہے۔ جس انسان نے دریافت (discovery) کے درجے میں حقیقت کو نہیں پایا، اس کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کا آغاز بھی نہیں ہوگا۔

ربانی شخصیت کا دوسرا سب سے بڑا جُز یہ ہے کہ وہ کامل معنوں میں ایک مثبت شخصیت ہو، وہ ہر قسم کے منفی احساسات (negative thoughts) سے پوری طرح خالی ہو۔ آخرت کی دنیا میں منفی شخصیت رکھنے والے انسان کا کوئی مقام نہیں۔

اِس کے بعد جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ کہ وہ اپنی دریافت کے مطابق، اپنی زندگی کی ترجیحات (priorities) قائم کرے۔ اِس معاملے میں وہ کسی بھی عذر (excuse) کو عذر نہ بنائے، خواہ بظاہر وہ عذر کتنا ہی زیادہ اہم کیوں نہ ہو — ایسا ہی انسان ربانی انسان ہے، اور یہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت کی ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔

قرآن سے رہ نمائی

ایک مسلم خطیب نے پُر جوش طور پر کہا کہ قرآن، سارا کا سارا، نعتِ نبوی ہے۔ اِس طرح ہر ایک اپنے ذہن کے مطابق، قرآن کے بارے میں کلام کر رہا ہے۔ قرآن کے بارے میں لوگوں کے خیالات بڑے عجیب ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ہمیں کسی تفسیر کی ضرورت نہیں، بقدر ضرورت عربی زبان جاننا، قرآن کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے، ہمیں حدیث سے رہ نمائی لینے کی ضرورت نہیں۔ کسی کا کہنا ہے کہ قرآن فہمی کا اصل راز یہ ہے کہ اُس کے نظم (order) کو سمجھا جائے۔ آیتوں اور سورتوں کے درمیان نظم کو جاننا ہی قرآن فہمی کی سب سے بڑی کلید ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جاہلی دور کے عرب شعرا کے کلام کا گہرا مطالعہ کیے بغیر کوئی شخص قرآن کو نہیں سمجھ سکتا۔ کسی کا کہنا ہے کہ قرآن اتنی زیادہ بابرکت کتاب ہے کہ اس کا ایک نسخہ گھر میں رکھنا ہی اس کی سعادتوں میں حصے دار بننے کے لیے کافی ہے۔ ایک ہندو اسکالر نے کہا کہ میں جب قرآن کو پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں گیتا کو پڑھ رہا ہوں، اور جب گیتا کو پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں قرآن کو پڑھ رہا ہوں۔ ایک مسیحی اسکالر نے کہا کہ قرآن تو عیسیٰ مسیح کی عظمت بتانے کے لیے اترا تھا۔ آپ دیکھئے، قرآن میں محمد اور احمد کا لفظ صرف 5 بار آیا ہے، اور عیسی مسیح کے الفاظ 36 بار آئے ہیں، وغیرہ۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اِن تمام قسم کے لوگوں میں ایک صفت مشترک طور پر پائی جاتی ہے، وہ یہ کہ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ آپ کا نقطۂ نظر قرآن کی کس آیت سے معلوم ہوتا ہے، تو اِن میں سے کوئی بھی اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں قرآن کی کوئی آیت بتانے سے قاصر رہتا ہے۔ اِن میں سے ہر ایک، اپنے نظریے کو نہایت جوش کے ساتھ بیان کرے گا، لیکن جب اُس سے پوچھا جائے کہ اپنے نظریے کی تائید میں قرآن کا حوالہ بتاؤ، تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرے گا، لیکن قرآن کی کوئی آیت اپنے نظریے کی تائید میں پیش نہ کر سکے گا — یہ سب غیر سنجیدگی کی باتیں ہیں اور جو لوگ غیر سنجیدگی میں مبتلا ہوں، وہ کبھی قرآن کو سمجھ نہیں سکتے۔

انسانی اَقدار

اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے، یعنی ایک خدا کو سب کچھ سمجھنا۔ بقیہ تمام چیزیں اِسی عقیدے کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں۔ عبادت، اخلاق، معاملات، سب کا سرچشمہ یہی عقیدۂ توحید ہے۔ ایک لفظ میں، اسلامی زندگی، خدارخی زندگی (God-oriented life) کا نام ہے۔

اسلام میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ اِن نمازوں کے دوران تقریباً تین سو بار اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ، بعض نمازوں کے بعد خصوصی تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ اِس میں بھی بار بار اللہ اکبر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ گویا کہ چوبیس گھنٹے کی پوری مدت میں ایک مسلمان جس بات کا سب سے زیادہ ذکر کرتا ہے، وہ اللہ اکبر ہے۔

اللہ اکبر کا مطلب ہے— خدا سب سے بڑا ہے۔ اِس طرح، اللہ اکبر میں ایک اور چیز اپنے آپ پوشیدہ ہے، وہ یہ کہ خدا کے سوا جو انسان ہیں، وہ سب کے سب برابر ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی انسان بڑا ہے اور نہ کوئی چھوٹا:

God is great, and all men and women are equals.

یہ عقیدہ کوئی سادہ عقیدہ نہیں۔ تمام بہترین انسانی اقدار (human values) اِسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب سب برابر ہیں، تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ سب کے حقوق بھی برابر ہیں۔ سب یکساں طور پر اِس قابل ہیں کہ ان کے ساتھ محبت اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے۔ سب کو یکساں طور پر عزت واحترام کا مستحق سمجھا جائے۔ اپنے اور غیر کے درمیان فرق کئے بغیر، ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔

ایک خاندان کے اندر جہاں خونی رشتہ (blood relation) سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں، وہاں خود بخود سب کے درمیان برابری کا ماحول قائم ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح، تمام عورت اور مرد ایک وسیع تر فیملی کے ممبر ہیں۔ اِس بڑے خاندان میں بھی وہی برابری مطلوب ہے جو چھوٹے خاندان کے درمیان پائی جاتی ہے۔

فائنل توجیہہ

اِس دنیا کی ہر چیز اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ شمسی نظام (solar system) اتنا زیادہ مکمل ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور شمسی نظام سوچا نہیں جا سکتا۔ ہماری زمین اپنے بے شمار اجزا کے ساتھ کامل معیار کا آخری نمونہ ہے۔ ہماری دنیا میں جو لائف سپورٹ سسٹم ہے، اُس سے بہتر لائف سپورٹ سسٹم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اِسی طرح، پہاڑ، دریا، درخت، حیوانات اور انسان، سب اپنے آخری معیاری ماڈل پر ہیں، حتی کہ گھاس کا جو ماڈل ہے، وہ بھی اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ کوئی آرٹسٹ کبھی گھاس کا اِس سے بہتر ماڈل نہیں بنا سکتا۔ یہی معاملہ خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کا ہے۔ یہ تخلیقی نقشہ بھی اپنے آخری کمال کی حد تک معیاری نقشہ ہے، حتی کہ اِس سے بہتر تخلیقی نقشے کا تصور ممکن نہیں۔

انسان کو خدا نے احسنِ تقویم کی صورت میں پیدا کیا، پھر موجودہ زمین پر اس کو عارضی طور پر ٹسٹ کے لیے رکھا اور یہ مقدر کیا کہ موت کے بعد کی ابدی دنیا میں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق، سزا یا انعام دیا جائے۔ اِسی کا نام تخلیقی نقشہ ہے۔ انسان جیسی مخلوق کے لیے بلاشبہہ یہ اعلیٰ ترین تخلیقی نقشہ ہے۔ اِس سے بہتر تخلیقی نقشے کا تصور یقینی طور پر ممکن نہیں۔

مثلاً انسان اپنے اندر بہت سی خواہشات (desires) رکھتا ہے۔ یہ خواہشات انسان کے دماغ میں ایک حسین تصور کے طور پر بسی ہوئی ہیں۔ ہر عورت اور مرد چاہتے ہیں کہ اُنھیں ایک ایسی دنیا ملے، جہاں ان کی تمام خواہشیں کسی روک ٹوک کے بغیر پوری ہوں۔ فلسفیوں اور مفکروں نے زندگی کے جتنے نقشے بنائے ہیں، اُن میں انسان کی اِن خواہشوں کی تکمیل (fulfilment) ممکن نہیں۔ مثلاً آواگون کا نظریہ اور اِفادی نظریہ، وغیرہ۔ آخرت کے نظریے کی صورت میں جو تخلیقی نقشہ سامنے آتا ہے، اُس میں آخری معیاری درجے میں اِن خواہشوں کی تکمیل کا سامان موجود ہے۔ نظریۂ آخرت کا یہ پہلو اِس بات کا آخری ثبوت ہے کہ وہی زندگی کا حقیقی نظریہ ہے۔ اِس کے سوا جو نظریات ہیں، وہ سب فرضی قیاسات ہیں، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

دردناک انجام

ہر آدمی اپنی ساری توانائی خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ پیسہ کماتا ہے، صرف اِس لیے تاکہ وہ جہنم کا مہنگا ٹکٹ خرید سکے — یہ جملہ اکثر نہایت درد کے ساتھ میری زبان سے نکل جاتا ہے۔

آج کل کے لوگوں کو میں دیکھتا ہوں کہ وہ اپنا سارا وقت اور اپنی ساری طاقت پیسہ کمانے میں لگائے ہوئے ہیں۔ اُن کو رات دن بس ایک ہی دُھن لگی رہتی ہے، وہ یہ کہ کس طرح وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن کی سورہ نمبر 102 میں تکاثر کہا گیا ہے، یعنی کماتے کماتے قبر میں پہنچ جانا اور پھر جہنم کا سامنا کرنا۔

آج کل یہ حال ہے کہ سیکولر لوگ اور نام نہاد مذہبی لوگ، دونوں ایک ہی چیز کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور وہ ہے ہر ممکن ذرائع سے زیادہ سے زیادہ دولت کمانا۔

پھر اِس دولت کا استعمال بھی صرف ایک ہے اور وہ ہے اپنی مادّی خوش حالی میں اضافہ کرنا۔ مکان اور سواری اور کپڑے جیسی چیزوں میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرنا۔ اگر کوئی شخص بظاہر مذہبی ہے، تو وہ صرف رسمی معنوں میں مذہبی ہے۔ مقصدِ زندگی کے اعتبار سے ہر ایک کا نشانہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے مادّی ترقی۔

ہر آدمی کی زندگی ایک تلخ انجام پر ختم ہو رہی ہے اور وہ ہے تمام مادّی ترقیوں کو چھوڑ کر اِس دنیا سے چلا جانا۔ یہ بے حد سنگین صورتِ حال ہے۔ اِس میں دنیا کے تقریباً تمام لوگ مبتلا ہیں۔ اپنے خیال کے مطابق، وہ ترقی کی طرف جا رہے ہیں، مگر موت ہر ایک کو بتا رہی ہے کہ تمھارا سفر صرف تباہی کے گڑھے کی طرف تھا، نہ کہ ترقی کی منزل کی طرف۔

کیسا عجیب ہے انسان کا یہ انجام کہ وہ اپنے بہترین وقت اور اپنی بہترین توانائی کو خرچ کر کے **لترونّ الجحیم** (التکاثر: 6) کا مصداق بن رہا ہے، یعنی جنت کا خواب دیکھنے والا، آخر کار اپنے آپ کو جہنم کے گڑھے میں گرا ہوا پائے۔

شکرِ خداوندی

مسٹر رجت ملہوترا نے بتایا کہ انھوں نے ٹیلی فون پر مسٹر شہزاد سے بات کی۔ مسٹر شہزاد کی عمر تقریباً چالیس سال ہے۔ وہ میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ وہ الرسالہ مشن سے جڑے ہوئے ہیں۔ اِس وقت اُن کو ایک شدید بیماری لاحق ہے۔ اِس بیماری کی وجہ سے اُن کا نظامِ ہضم بڑی حد تک معطل ہو چکا ہے۔ مسٹر شہزاد نے ٹیلی فون پر بتایا کہ کچھ لوگ میرے پاس عیادت کے لیے آئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ عیادت کا ثواب آپ کو صرف اُس وقت ملے گا، جب کہ آپ مجھ کو دیکھ کر حقیقی معنوں میں الحمدللہ کہہ سکیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا حال یہ ہے کہ پانی پینا بھی میرے لیے مشکل ہے۔ اگر آدھی روٹی کھالوں تو وہ گھنٹوں ہضم نہیں ہوتی۔ ہضم کا قدرتی نظام اپنا کام نہیں کر رہا ہے۔ آپ کو یہ کہنا چاہیے کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ ہم پانی پی سکتے ہیں، ہم کھانا کھا سکتے ہیں، پانی اور کھانا ہمارے پیٹ کے اندر داخل ہو کر ہضم ہو جاتا ہے۔ یہ بات جو آپ کو حاصل ہے، وہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اِس کا شکر ادا کرنے کے لیے انسانی زبان میں الفاظ موجود نہیں۔

شہزاد صاحب آج کل صاحبِ فراش ہیں۔ اِس سے پہلے وہ نہایت سرگرمی کے ساتھ دعوت الی اللہ کا کام کرتے رہے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن وہ باقاعدہ طور پر الرسالہ مطبوعات کو لوگوں تک پہنچانے میں صرف کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ایک ہندو ڈاکٹر کے یہاں گئے۔ وہ اُن سے مل کر ان کو ہمارے یہاں کا چھپا ہوا انگریزی لٹریچر دینا چاہتے تھے۔ کلینک کے کارکن نے اُن کو منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بہت مصروف ہیں، آپ اُن سے مل نہیں سکتے۔ وہاں کا قاعدہ یہ تھا کہ مریض پہلے وزیٹنگ فیس کے طور پر سو روپئے جمع کرواتا تھا۔ اس کے بعد وہ لائن میں کھڑا ہو کر ڈاکٹر تک پہنچتا تھا۔ شہزاد صاحب نے یہ کیا کہ وزٹنگ فیس جمع کر کے وہ لائن میں کھڑے ہو گئے۔ جب ان کی باری آئی اور وہ ڈاکٹر تک پہنچے تو انھوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ مجھے کوئی بیماری نہیں۔ میں صرف آپ کو یہ چند لٹریچر دینا چاہتا تھا۔ یہاں کے قاعدے کے مطابق، چوں کہ میں مریضوں کی لائن میں کھڑے ہوئے بغیر آپ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اِس لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ یہ سن کر مذکورہ ہندو ڈاکٹر بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے خوشی سے لٹریچر لے لیا اور کہا کہ آئندہ آپ جب بھی چاہیں، پیشگی اپائنٹ مینٹ کے بغیر مجھ سے مل سکتے ہیں۔

جہاد، قتال

جہاد اور قتال دونوں ہم معنٰی الفاظ نہیں۔ جہاد کا مطلب پُر امن جدوجہد ہے، اور قتال کا لفظ جنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم جہاد کا لفظ توسیعی طور پر کبھی جنگ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جہاد بہ معنی قتال کی کچھ لازمی شرطیں ہیں۔ اِن شرطوں کے بغیر کیا ہوا عمل، اسلامی شریعت کے مطابق، جہاد نہیں۔

1- جہاد بہ معنٰی قتال کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ خارجی حملے کے وقت بہ طور دفاع ہوتا ہے۔ یہ دفاعی جنگ صرف ایک قائم شدہ حکومت کر سکتی ہے، عام لوگوں کو کسی بھی عذر کی بنا پر اِس کا حق نہیں۔ غیر حکومتی افراد یا تنظیموں (NGOs) کے لیے صرف پر امن کوشش ہے، نہ کہ مسلح کارروائی۔

2- اسلام میں سرّی جنگ (secret war) جائز نہیں۔ اگر کوئی مسلم حکومت کسی کے خلاف دفاعی جنگ کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس کو اعلان کرنا ہوگا۔ اعلان کے بغیر، دفاعی جنگ جائز نہیں۔

3- اگر کوئی مسلم گروہ کسی ملک کے اندر رہتا ہے اور حالات کے مطابق، وہ مسلح جنگ کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو اس کو سب سے پہلے اُس ملک سے ہجرت کرنا ہوگا۔ ملک کے اندر رہتے ہوئے کسی قسم کی مسلح کارروائی اسلام میں جائز نہیں۔

4- ایک جائز جنگ میں بھی صرف مقاتِل (combatant) کو مارا جا سکتا ہے، غیر مقاتِل (non-combatant) کو مارنا جائز نہیں۔

5- اسلام میں صرف حملہ آور (agressor) کے خلاف جنگ ہے، دشمن کے خلاف جنگ نہیں۔ دشمن کے مقابلے میں صرف پُر امن ڈائلاگ ہے، نہ کہ مسلح کارروائی۔

6- اسلامی تعلیمات کے مطابق، اسلام میں جنگ کی حیثیت عموم (rule) کی نہیں، اسلام میں جنگ کی حیثیت صرف ایک استثنا (exception) کی ہے۔ اسلام میں کرنے کا اصل کام پُر امن دعوت ہے۔ اگر جنگ کی صورتِ حال پیش آئے، تب بھی ساری کوشش اُس سے اعراض کے لیے کی جائے گی، نہ کہ فوراً لڑائی چھیڑ دینے کی۔ اسلام کی تمام تعلیمات، براہِ راست یا بالواسطہ طور پر، امن کے اصول پر مبنی ہیں، نہ کہ جنگ کے اصول پر۔

اللہ اکبر کی اسپرٹ

اسلام کی اسپرٹ کو ایک لفظ میں، اللہ اکبر اسپرٹ کہہ سکتے ہیں۔ اسلام کی سب سے بڑی عبادت نماز ہے، جو رات دن میں پانچ بار ادا کی جاتی ہے۔ نوافل کی صورت میں جو نمازیں پڑھی جاتی ہیں، وہ اِن کے علاوہ ہیں۔ اِن نمازوں میں اور اذان و اقامت میں اللہ اکبر کا لفظ روزانہ تقریباً تین سو بار دہرایا جاتا ہے۔

اللہ اکبر کا مطلب ہے — اللہ بڑا ہے۔ اِس میں اپنے آپ یہ بات شامل (implicit) ہے کہ میں بڑا نہیں ہوں۔ اِس طرح ہر صاحبِ ایمان روزانہ بار بار اِس بات کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے کہ بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے، میرے لیے کوئی بڑائی نہیں۔ باجماعت نماز اِسی حقیقت کا ایک عملی مظاہرہ ہے۔ باجماعت نماز میں یہ ہوتا ہے کہ تمام اہلِ ایمان اپنے درمیان سے ایک شخص کو آگے بڑھا کر سب اس کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ اکبر اسپرٹ کے اظہار کی ایک اجتماعی صورت ہے۔

اللہ اکبر کا مقصد دراصل آدمی کے اندر تواضع (modesty) کی اسپرٹ پیدا کرنا ہے۔ تواضع کی اسپرٹ حقیقی معنوں میں جب آدمی کے اندر پیدا ہو جاتی ہے، تو وہ کسی حد پر نہیں رکتی، یہ اسپرٹ جس طرح خدا کے سامنے ظاہر ہوتی ہے، اُسی طرح وہ انسان کے مقابلے میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اہلِ ایمان کی پہچان یہ ہے کہ اللہ اکبر کی اسپرٹ، یا تواضع کی اسپرٹ ان کی عملی زندگی میں پوری طرح شامل ہو جائے۔

اللہ اکبر کی اسپرٹ والے لوگ کبھی انانیت اور کبر کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ وہ ہرگز وہ کام نہیں کریں گے جس کو ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا'' کہا جاتا ہے۔ دوسروں کی ماتحتی قبول کرنا ان کو ایک عبادتی فعل معلوم ہوگا۔ ان کی روح کو خود جھکنے میں خوشی ہوگی، نہ کہ دوسروں کو اپنے آگے جھکانے میں۔ وہ اپنی غلطی کا فوراً اعتراف کر لیں گے۔ وہ قیادت کے شوق سے آخری حد تک خالی ہوں گے۔

نیا انسان

جس زمانہ میں برطانیہ کی حکومت ساری دنیا میں چھائی ہوئی تھی، اس زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ برطانیہ کا بادشاہ بھیس بدل کر اپنی مملکت کو دیکھنے کے لیے نکلا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ برطانی فوج کے ایک افسر کے دفتر میں گیا۔ اس نے انگریز افسر سے پوچھا کہ ٹپس برگ کا راستہ کدھر سے جاتا ہے۔ افسر بگڑ گیا۔ اس نے کہا تم ٹپس برگ کا راستہ کسی سے بھی پوچھ سکتے تھے۔ اس کے لیے تمھیں میرے دفتر میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ نووارد نے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ اس نے کہا کیا تم کوئی فوجی افسر ہو۔ نووارد نے کہا کہ میں اس سے بھی بڑا ہوں۔ اس نے کہا کیا تم کیپٹن ہو۔ نووارد نے کہا کہ میں اس سے بھی بڑا ہوں۔ اس نے کہا کیا تم کرنل ہو۔ نووارد نے کہا کہ میں اس سے بھی زیادہ بڑا ہوں۔ اس نے کہا کیا تم جنرل ہو۔ نووارد نے کہا کہ میں اس سے بھی زیادہ بڑا ہوں۔ اس نے کہا کیا تم فیلڈ مارشل ہو۔ نووارد نے کہا کہ میں اس سے بھی زیادہ بڑا ہوں۔ اب فوجی افسر بولا: کیا تم بادشاہ ہو۔ نووارد نے کہا کہ ہاں۔ فوجی افسر یہ سن کر کانپ اٹھا۔ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور کہا کہ لو، اس سے مجھے شوٹ کر دو۔ میں نے اپنے بادشاہ کی توہین کی ہے۔ اس لیے میری سزا یہی ہے کہ مجھے گولی ماردی جائے۔

بادشاہ نے کہا کہ تم میری فوج کے ایک لائق افسر ہو اس لیے میں تم کو گولی نہیں ماروں گا۔ میں تم کو ایک اور سزا دیتا ہوں وہ سزا یہ ہے کہ آج سے تم ایسا کرو کہ جب بھی تم کسی انسان سے کوئی معاملہ کرو تو یہ سوچ لو کہ تمھارا بادشاہ تمھارے سامنے کھڑا ہے۔ فوجی افسر نے اس کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی بدل گئی۔ وہ آخر عمر تک نہایت محتاط زندگی گزارتا رہا، یہاں تک کہ اسی حال میں مر گیا۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر خدا اور انسان کا ہے۔ انسان طرح طرح کی سرکشی کرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خدا کو اپنے سے دور سمجھتا ہے۔ اگر وہ جان لے کہ خدا عین اس کے قریب موجود ہے۔ وہ اس کو ہر لمحہ دیکھ رہا ہے تو اچانک اس کی سوچ میں ایک انقلاب آجائے۔ وہ اپنے ہر قول اور ہر فعل میں آخری حد تک محتاط روش اختیار کر لے۔

غلط فہمی سے بچئے

ایک بار مجھے ایک شہر میں ایک پروگرام میں شرکت کے لیے بلایا گیا۔ واپسی میں پروگرام کے ناظم نے مجھے ایک بند لفافہ دیا۔ میں نے اِس لفافے کو لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور واپس چلا آیا۔ اُس وقت ایک صاحب وہاں موجود تھے۔ انھوں نے مجھ سے اِس لفافے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ بہ طورِ خود انھوں نے قیاس کر لیا کہ اِس لفافے میں دس ہزار روپئے تھے۔ اپنے قیاس کو لے کر انھوں نے دوسروں سے اِس کا چرچا بھی شروع کر دیا۔

بعد کو میرے پاس ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ اُس وقت وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مجھ کو ناظمِ پروگرام نے دس ہزار روپئے کا لفافہ دیا۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ — اِس زمانے میں مولویوں کو بہت اچھا کاروبار مل گیا ہے۔ ایک تقریر کرو اور دس ہزار روپئے لے لو۔

میں نے انھیں بتایا کہ اس لفافے میں دس ہزار روپئے نہیں، بلکہ پانچ ہزار روپئے تھے۔ اس میں پچاس پچاس روپئے کے نوٹ تھے، اِس لیے لفافہ موٹا دکائی دے رہا تھا اور اِس بنا پر انھوں نے اُس کو دس ہزار روپئے سمجھ لیا۔ پھر میں نے بتایا کہ یہ روپیہ میرا نہیں تھا، وہ دہلی کے ایک صاحب کا تھا، جنھوں نے ناظمِ پروگرام کے کہنے پر مجھ کو مذکورہ سفر کے لیے جہاز کا رٹرن ٹکٹ خرید کر دیا تھا جس کی قیمت پانچ ہزار روپئے تھی۔ یہ ایک امانت تھی جس کو مجھے اُن صاحب کو پورا کا پورا ادا کرنا تھا۔ چناں چہ دہلی واپسی کے بعد میں نے فوراً مذکورہ صاحب کو بلا کر وہ پوری رقم ان کے حوالے کر دی۔ مزید میں نے مذکورہ صاحب سے ایک تحریر لی، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ وہ پوری رقم میری تھی اور مجھ کو واپس مل گئی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلط فہمی کس طرح پیدا ہوتی ہے، وہ اکثر خود ساختہ قیاس کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ تحقیق کے بغیر محض قیاس اور گمان کی بنا پر کسی کے خلاف بری رائے نہ قائم کرے۔ اِس قسم کی رائے زنی بلاشبہہ ایک ایسا گناہ ہے جس پر خدا کے یہاں سخت پکڑ ہوگی۔

ٹیم ورک کی اہمیت

مولانا مناظر احسن گیلانی (وفات: 1956) ایک بار دارالمصنفین (اعظم گڑھ) آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مولانا سید سلیمان ندوی (وفات: 1953) یہاں رہا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذاتی محنت سے بہت سی اہم کتابیں تصنیف کی تھیں۔ اِس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا گیلانی نے کہا— یورپ میں جو کام اکادمی کرتی ہے، ہندستان میں اُس کو اک آدمی کرتا ہے۔ میں کہوں گا کہ قدیم حالات میں کوئی ایک شخص بھی بڑا کام کرسکتا تھا۔ لیکن موجودہ حالات میں کوئی بڑا کام کرنے کے لیے ٹیم ورک لازمی طور پر ضروری ہوگیا ہے۔

موجودہ زمانے میں علم کا جو اعلیٰ معیار قائم ہوا ہے، اُس اعلیٰ معیار پر کوئی بڑا علمی کام ایک فرد انجام نہیں دے سکتا، اُس کو انجام دینے کے لیے ایک ٹیم درکار ہوتی ہے۔ چناں چہ موجودہ زمانے میں تمام بڑے بڑے علمی کام ٹیم کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ مسلمان موجودہ زمانے میں وقت کے اعلیٰ علمی معیار پر کوئی کتاب تیار نہ کرسکے۔ اُس کا سبب یہی ہے کہ اُن کے یہاں ابھی تک ایک فرد کتاب لکھتا ہے، اکیڈمک ورک (academic work) کا ابھی تک مسلمانوں کے یہاں رواج نہیں۔

اِس معاملے میں ایک سبق آموز مثال قرآن کے انگریزی ترجمے کی ہے۔ پرنٹنگ پریس کے زمانے میں، قرآن کے بہت سے انگریزی ترجمے کیے گئے ہیں۔ اکثر انگریزی ترجمے ہمارے یہاں موجود ہیں۔ یہ تمام ترجمے شخصی کوشش کے ذریعے تیار کیے گئے ہیں۔ میں عرصہ دراز سے قرآن کے انگریزی ترجمے دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے پایا ہے کہ ہر ترجمے میں دو بنیادی کمی پائی جاتی ہے۔ ایک، یہ کہ بہت سے مقامات پر ترجمے غلط کیے گئے ہیں، اور دوسری بات یہ کہ اِن ترجموں میں وضوح (clarity) بہت کم ہے۔ قرآن کی خاص صفت یہ ہے کہ اس کے اندر کمال درجے میں وضوح پایا جاتا ہے۔ لیکن اِن انگریزی ترجموں میں قرآن کی یہی اہم صفت بڑی حد تک موجود نہیں۔

قرآن کے موجودہ انگریزی ترجموں میں اِس کمی کا احساس مجھ کو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ یہ احساس

مجھ کو ستاتا تھا کہ وقت کی بین اقوامی زبان میں خدا کی کتاب کا صحیح اور موثر ترجمہ موجود نہیں۔ میں اِس کام کو وقت کے مسلمّہ معیار پر کرنا چاہتا تھا۔ اِس کے لیے میں نے بہت سے اہلِ علم کو متوجہ کرنا چاہا، مگر کوئی اِس کے لیے تیار نہ ہوا۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود اِس کام کی ذمے داری لوں اور ٹیم ورک کے ذریعے قرآن کا مطلوب انگریزی ترجمہ تیار کرنے کی کوشش کروں۔

پچھلے تقریباً بیس سال سے میں اور میرے ساتھی خاموشی کے ساتھ اِس کام میں اپنی کوشش صرف کرتے رہے ہیں۔ میرے سوا، کئی لوگ مثلاً ڈاکٹر فریدہ خانم، ڈاکٹر ثانی اثنین خاں وغیرہ اِس مشکل کام میں ڈیڈی کیشن کے ساتھ مشغول رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے قرآن کا یہ انگریزی ترجمہ تیار ہو چکا ہے اور اب اُس کا دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ یہ انگریزی ترجمہ پورے معنوں میں ٹیم ورک کا نتیجہ ہے۔ اِس کے ذریعے پہلی بار قرآن کا ایک ایسا انگریزی ترجمہ وجود میں آیا ہے جو ان شاء اللہ درست بھی ہے اور وضوح (clarity) اُس کے اندر پوری طرح پایا جاتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ اسلام کا کلمہ ساری دنیا کے ہر گھر میں پہنچ جائے گا۔ میرا احساس یہ ہے کہ اِس حدیث میں کلمۂ اسلام سے مراد کلام الٰہی (Word of God) ہے، یعنی قرآن۔ اِس حدیث میں جس واقعے کی پیشین گوئی کی گئی ہے، اُس کا تعلق پرنٹنگ پریس کے زمانے سے ہے۔ یہ صرف موجودہ پریس کے زمانے میں ممکن ہوا ہے کہ قرآن کے مطبوعہ نسخے تمام دنیا کے ہر گھر میں پہنچا دیئے جائیں۔ اب جب کہ اللہ کی توفیق سے، وقت کی بین اقوامی زبان میں قرآن کا صحیح ترجمہ وجود میں آچکا ہے، پوری ملت کا یہ فرض ہے کہ وہ متحدہ کوشش کے ذریعے قرآن کے اِس نسخے کو سارے عالم تک پہنچا دے، وہ اُس کو دنیا کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں داخل کر دے۔

میرا احساس ہے کہ اِس طرح قرآن کا ساری دنیا میں، ہر گھر اور ہر مقام میں، پہنچ جانا اتمامِ حجت کا آخری واقعہ ہوگا۔ انسانی تاریخ غالباً اپنے آخری دور میں پہنچ چکی ہے۔ اِس آخری دور میں جو سب سے بڑا دعوتی کام انجام پانا ہے، وہ بلاشبہہ یہی ہے کہ خدا کا کلام خدا کے تمام بندوں تک ان کی قابلِ فہم زبان میں پہنچا دیا جائے۔

پیغمبر کا طریقہ

انڈیا کے ایک شہر میں ہندوؤں کا مذہبی جلوس نکلا۔ اپنے رواج کے مطابق، وہ ایک دوسرے پر رنگ (گُلال) ڈال رہے تھے۔ راستے میں ایک مسجد پڑی۔ چناں چہ مسجد کی بیرونی دیوار پر بھی گلال کے چھینٹے پڑ گئے۔ وہاں کچھ مسلم نوجوان تھے۔ وہ اِس پر غصہ ہو گئے۔ انھوں نے جلوس نکالنے والوں پر اعتراض کیا، پھر دونوں کے درمیان اشتعال انگیز تکرار (heated exchange) ہوئی۔ اس کے بعد لڑائی شروع ہوگئی۔ آخر میں فرقہ وارنہ فساد بھڑک اٹھا۔ اِس فساد میں اُس مقام کے مسلمانوں کو زبردست جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

اِس کے بعد جگہ جگہ مسلمانوں کے جلسے ہوئے۔ مقررین کی بڑی تعداد مسجدوں اور مدرسوں سے نکل کر اسٹیج پر آ گئی۔ ان کی پُر جوش تقریروں کا خلاصہ صرف ایک تھا— مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ انتظامیہ مسلمانوں کے اوپر زیادتی کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو محاصرہ (seige) کی حالت میں پہنچا دیا گیا ہے، وغیرہ۔

اب دوسری مثال لیجیے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مدینہ کی مسجد کے اندر ایک مشرک بدو داخل ہوا۔ اُس نے نجاست کے ذریعے مسجد کو گندا کر دیا۔ اِس پر کچھ صحابہ غصہ ہوئے۔ لیکن پیغمبر اسلام نے صحابہ سے کہا کہ غصہ نہ کرو، بلکہ پانی لے کر اُس مقام پر بہا دو۔ وہ جگہ پاک ہو جائے گی۔ اِس پیغمبرانہ سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس مشرک بدو نے اسلام قبول کر لیا (صحیح البخاری)

مذکورہ مسلمانوں کا طریقہ جاہلیت کا طریقہ ہے۔ اور دوسرا طریقہ پیغمبرانہ طریقہ۔ موجودہ زمانے کے مسلمان جاہلیت کے طریقوں کی وجہ سے مختلف قسم کی مصیبتوں کا شکار ہیں۔ اِس کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمان جاہلیت کے طریقے کو چھوڑیں، اور پیغمبر کے نمونے کے مطابق، صحیح دینی طریقہ اختیار کریں۔ اِس معاملے میں اصل کام اپنی غلطی کی اصلاح کرنا ہے، نہ کہ فریقِ ثانی کے خلاف چیخ و پکار کرنا۔

فارمل ایجوکیشن، اِنفارمل ایجوکیشن

موجودہ زمانے میں مختلف رہ نماؤں نے بڑے بڑے ادارے بنائے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ اِن اداروں میں اپنے نوجوانوں کو تربیت دے کر ایک نئی نسل بنا سکیں گے۔ مگر یہ تمام خواب منتشر ہو کر رہ گئے۔ کوئی بھی ادارہ مطلوب نئی نسل کو وجود میں لانے کا ذریعہ نہ بن سکا۔ ایسا صرف اِس لیے ہوا کہ یہ منصوبہ غیر فطری تھا، اور کوئی بھی غیر فطری منصوبہ اِس دنیا میں کبھی کامیاب ہونے والا نہیں۔

تعلیم کی دو قسمیں ہیں — فارمل ایجوکیشن (formal education)، اور اِنفارمل ایجوکیشن (informal education)۔ فارمل ایجوکیشن وہ ہے جو وقت کے منظّم اداروں میں باقاعدہ نصاب کے تحت دی جاتی ہے۔ اِنفارمل ایجوکیشن سے مراد تعلیم کے وہ غیر رسمی ذرائع ہیں جو ادارے سے باہر اپنا کام کرتے ہیں۔ مثلاً لٹریچر اور تربیت بذریعہ صحبت، وغیرہ۔

صحیح یہ ہے کہ فارمل ایجوکیشن کو تعلیم برائے تعلیم (education for the sake of education) کے اصول پر چلایا جائے۔ اور جہاں تک ذہن سازی یا افراد سازی کا معاملہ ہے، اُس کو اِنفارمل ایجوکیشن کے ذریعے انجام دیا جائے، ایجوکیشن کے یہ دونوں ذرائع ہر اعتبار سے، ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ الگ الگ رکھ کر ہی اُن کو بخوبی طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔ اگر دونوں کو یک جا کر دیا جائے تو دونوں میں سے کسی ایک کے بھی تقاضے پورے نہ ہوں گے، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں میں سے کسی ایک کا بھی مطلوب فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ موجودہ زمانے میں اِنفارمل ایجوکیشن کے ذرائع بہت بڑھ گئے ہیں۔ لیکن اِن بڑھے ہوئے ذرائع کا استعمال ذہن سازی یا افراد سازی کے لیے نہ ہو سکا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ یہ کام صرف اُس وقت انجام پاتا ہے، جب کہ ایک اعلیٰ صلاحیت کا انسان ایک قربانی دے، وہ یہ کہ وہ شہرت اور قیادت کے اسٹیج کو چھوڑ دے اور ایک مقام پر بیٹھ کر اپنے آپ کو ہمہ تن افراد سازی کے خاموش کام میں لگا دے۔ موجودہ زمانے کے رہ نماؤں نے یہ قربانی نہیں دی، اِس لیے اِنفارمل ایجوکیشن کا کام بھی اعلیٰ امکانات کے باوجود موثر طور پر انجام نہ پا سکا۔

خوش فکری، یا حقیقت پسندی

ایک باپ کو اپنے بیٹے سے بہت تعلق تھا۔ باپ کے ذہن میں کام کا ایک آئڈیل تصور تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اُس آئڈیل کام کے لیے تیار کرے۔ اِس مقصد کے لیے اُس نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اُس کی امیدیں تمام تر اپنے بیٹے سے وابستہ ہوگئیں۔ جب بیٹا بڑا ہوگیا اور اس کی تعلیم مکمل ہوگئی تو باپ نے چاہا کہ اس کا بیٹا اس کے پسندیدہ کام میں لگے۔ لیکن بیٹے نے انکار کردیا۔ باپ نے بہت کچھ کہا، لیکن بیٹے کی سمجھ میں نہ آیا۔ بیٹے نے آخری طور پر اپنے باپ سے کہہ دیا— بیٹا جب بڑا ہوجاتا ہے تو وہ خود اپنی عقل سے کام کرتا ہے۔

بیٹے کا یہ جواب سُن کر باپ کو اتنی مایوسی ہوئی کہ وہ نفسیاتی مریض بن گیا۔ اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس معاملے میں باپ کی غلطی تھی، نہ کہ بیٹے کی غلطی۔ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ ہر بچہ عقل وشعور لے کر پیدا ہوتا ہے۔ چھوٹی عمر میں جب وہ ناپختہ (immature) ہوتا ہے، اُس وقت وہ باپ اور ماں کی بات کو سنتا ہے۔ لیکن جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اس کا شعور پختہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اُس کے اندر خود فکری (self-thinking) کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اپنی عقل سے آزادانہ فیصلہ کرنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ قسم کے والدین کی سوچ غیر فطری ہے، وہ کبھی واقعہ بننے والی نہیں۔

والدین کو چوں کہ اپنے بیٹے سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے۔ محبت کے جذبے کے تحت، وہ اپنے بیٹے کے بارے میں خوش فکر (wishful) بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے سے ایسی امیدیں قائم کرلیتے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہوتی ہے۔

اِس خوش فکری (wishful thinking) میں تقریباً ہر باپ مبتلا رہتا ہے۔ اِس قسم کی خوش فکری اِس دنیا میں کبھی واقعہ بننے والی نہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ حقیقت پسند بنیں، تاکہ وہ اپنی اولاد کے بارے میں مایوسی کا شکار نہ ہوں۔

بچوں کا دکھ جھیل رہے ہیں

ایک سینئر مسلم تاجر سے ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ کو خدا نے پنچانوے سال کی عمر دی، یعنی تقریباً ایک صدی۔ اِس لمبی زندگی میں آپ نے کیا سیکھا اور کیا تجربہ کیا۔ اِس سوال کے بعد وہ دومنٹ چپ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے نہایت سنجیدہ انداز میں کہا— کوئی تجربہ نہیں۔ بس پیدا ہوئے۔ بڑے ہوئے تو بزنس میں لگ گئے۔ شادی کی اور بچے پیدا کیے۔ بچوں کو سیٹل (settle) کیا۔ اب آخر عمر میں بچوں کا دکھ جھیل رہے ہیں، اور موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانے میں یہی ہر گھر کی کہانی ہے۔ موجودہ زمانے میں تقریباً ہر ماں باپ کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی تمام محبتوں کا مرکز بناتے ہیں۔ بچوں کی زندگی سنوارنے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں، مگر آخر میں ہر ایک کا یہ حال ہوتا ہے کہ بچے غیر وفادار نکلتے ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر اپنی آزاد زندگی بنا لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں ماں باپ کی خدمت ایک فرسودہ تصور بن چکا ہے۔ بچوں کی ترقی کو ماں باپ اِس حسرت کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں کہ جس پیڑ کو ہم نے محنت کر کے اگایا تھا، اُس پیڑ کا سایہ اُنھیں حاصل نہیں ہوا۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا، جب کہ بچے اپنے دوست کے ساتھ حسن سلوک کریں گے، اور اپنے ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی کریں گے (**بَرَّ صَدیقَه و جَفا أباه۔ التّرمذی، کتاب الفتن**)۔ یہ حدیثِ رسول، موجودہ زمانے پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ آج ساری دنیا میں عمومی طور پر ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اِس واقعے کا سب سے زیادہ برا حصہ اُن لوگوں کو مل رہا ہے جو ساری زندگی بچوں کو خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں اور آخر میں ان کے حصے میں غم کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔

مزید یہ کہ ایسے ماں باپ اُس حدیث کا مصداق ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ سب سے زیادہ گھاٹے میں وہ شخص ہے جو دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت کو کھو دے (**أذهب اٰخرته بدنيا غيره۔ ابن ماجة، كتاب الفتن**)۔

دعوت کے عمومی مواقع

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو 610ء میں نبوت عطا ہوئی۔ اُس وقت آپ مکہ کے قریب حرا پہاڑ کے ایک غار میں تھے۔ پہلی وحی کے بعد آپ پر جو دوسری وحی اتری، وہ قرآن کی سورہ نمبر 74 کی ابتدائی آیتیں تھیں۔ اِن آیتوں میں آپ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **یا أیھا المدثّر، قُم فأنذر، وربّك فكبّر، وثیابك فطھّر، والرُّجزَ فاھجر** (المدثر: 5-1) یعنی اے اوڑھ کر لیٹنے والے، اٹھ اور لوگوں کو آگاہ کر اور اپنے رب کی بڑائی بول۔ اور اپنے کپڑے کو پاک رکھ۔ اور گندگی کو چھوڑ دے۔

اِن آیتوں میں اخلاق کے آداب نہیں بتائے گئے ہیں، بلکہ دعوت کے آداب بتائے گئے ہیں۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ اٹھو اور لوگوں کو توحید کی دعوت دو، لوگوں کے سامنے خدا کی بڑائی بیان کرو، لوگوں کی برائیوں سے اعراض کرتے ہوئے تمام مواقعِ دعوت کو استعمال کرو۔

دعوت کے مقصد کے لیے داعی کو لوگوں کے درمیان جانا پڑتا ہے۔ قدیم مکہ میں کعبہ وہ جگہ تھی، جہاں لوگ اکٹھا ہوتے تھے۔ اِسی مقصد کے لیے وہاں ہر قبیلے کے بتوں کو رکھ دیا گیا تھا۔ اُس وقت کعبہ کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ وہاں تمام عرب قبائل کے بت رکھے ہوئے تھے، اور دوسرا یہ کہ اِنھیں بتوں کی وجہ سے وہاں لوگوں کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ ایسی حالت میں رسول اللہ کو یہ حکمت بتائی گئی کہ بتوں کی موجودگی کے مسئلے کو نظر انداز کرو اور وہاں کے اجتماع کو دعوت کے لیے استعمال کرو۔ اِس حکمت کو ایک لفظ میں اِس طرح بیان کیا جا سکتا ہے — مسائل کو نظر انداز کرو اور دعوت کے مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problems and avail the opportunities.

یہ حکمت صرف قدیم مکی دور کے لیے نہ تھی، بلکہ وہ آج کے زمانے میں بھی پوری طرح مطلوب ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ دعوت کے لیے انسانوں کا اجتماع (gathering) درکار ہے۔ یہ اجتماع صرف دعوت کے لیے نہیں ہو سکتا، وہ لوگوں کے اپنے مقاصد کے لیے ہوگا۔ جیسا کہ کعبہ میں بتوں کی پرستش کے لیے ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ اجتماع اور مقصدِ اجتماع، دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا جائے۔ داعی کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اکٹھا ہونے والے لوگ بطور خود

کس مقصد کے لیے اکھٹا ہوئے ہیں۔ اُس کو صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ وہاں کچھ لوگ اکھٹا ہیں اور یہ اکھٹا ہونے والے لوگ اُسی مخصوص مقام پر ملیں گے، نہ کہ کسی دوسرے مقام پر۔

قدیم مکہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم یہ کرتے تھے کہ وہ تقریباً روزانہ کعبہ میں جاتے اور وہاں اکھٹا ہونے والے لوگوں کو قرآن کی آیتیں سنا کر اُنھیں دعوت کا پیغام دیتے۔ اِس سنتِ نبوی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمع ہونے والے لوگ اگر بالفرض رُجز (گندگی) کے لیے جمع ہوئے ہوں، تب بھی داعی کو چاہیے کہ وہ رجز کے پہلو کو نظر انداز کرے اور مقامِ اجتماع کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں دعوہ ورک کرے۔ داعی کا فارمولا یہ ہونا چاہیے:

Save yourself, and do Dawah work

اجتماع ہمیشہ تاریخی روایات کے تحت ہوتا ہے۔ کچھ چیزیں ہمیشہ لمبی روایت کے نتیجے میں موضوعِ اجتماع بن جاتی ہیں۔ اِس لیے لوگ اِن روایتی عنوانات کے تحت اکھٹا ہوتے ہیں۔ مثلاً نکاح، ولیمہ، خاندانی تقریبات، اداروں کے سالانہ جلسے، تعزیتی اور تہنیتی تقریبات، مشہور شخصیات کے نام پر اجتماعات، جماعتوں اور پارٹیوں کے فنکشن، مختلف قسم کے تہوار اور جشن، میلہ اور عُرس، وغیرہ۔ اِس قسم کے اجتماعات مختلف مقاصد کے تحت کیے جاتے ہیں، مگر اِس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہاں کثیر تعداد میں عورت اور مرد اکھٹا ہوتے ہیں۔ گویا کہ مقصدِ اجتماع خواہ کچھ بھی ہو، لیکن ہر اجتماع داعی کو ایک قابلِ خطاب مجمع (audience) فراہم کرتا ہے۔ داعی کو چاہیے کہ وہ اِس معاملے میں اعراض کے اصول کو اختیار کرے، یعنی وہ غیر مطلوب پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے، صرف مطلوب دعوتی پہلو کو دیکھے اور اِن مواقع میں شریک ہو کر دعوتی مقصد کے لیے اس کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔

مشہور قول ہے: **خذ ما صَفا وَ دَع ما کدِر** (پسندیدہ چیز کو لے لو اور ناپسندیدہ چیز کو چھوڑ دو)۔ یہ قول مذکورہ دعوتی حکمت کو بتاتا ہے، وہ یہ کہ لوگوں کے جمع ہونے کے مقام پر اگر ناپسندیدگی کے کچھ اسباب ہوں تو اُن کو نظر انداز کرو اور اس کے پسندیدہ پہلو، یعنی دعوتی موقع کو اصلاح و تبلیغ کے لیے استعمال کرو۔ یہ حکمت، دعوت کی توسیع و اشاعت کے لیے بے حد کارآمد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس حکمت کو اختیار کیے بغیر دعوتِ حق کی عمومی توسیع کا کام انجام دینا ممکن نہیں۔

آگ کی طرف چھلانگ

موجودہ زمانے میں جگہ جگہ ایسا ہورہا ہے کہ کچھ انتہا پسند مسلمان خودساختہ تصورِ شہادت (استشہاد) کے تحت، خودکُش بم باری (suicide bombing) کررہے ہیں۔ وہ مفروضہ دشمن کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنے آپ کو ہلاک کررہے ہیں۔ یہ بلاشبہہ خودکشی کا فعل ہے جو اسلام میں ثابت شدہ طور پر حرام ہے، اور حرام موت کا انجام یقینی طور پر جہنم ہے۔ عجیب بات ہے کہ مسلم رہ نما اِس حرام فعل کی کھلی مذمت نہیں کرتے، بلکہ عرب علماء استشہاد (طلب شہادت) کے خودساختہ تصور کے تحت اس کو جائز ٹھیرا رہے ہیں۔

اِس معاملے پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ مشرقی یوپی میں ایک مسلمان تھے۔ وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے، لیکن وہ اچھی تقریر کرنا جانتے تھے۔ انھوں نے اپنے لیے کسبِ معاش کا یہ طریقہ نکالا کہ وہ جہاں دیکھتے کہ لوگ مسجد بنوانا چاہتے ہیں، وہ اُن سے کہتے کہ تم لوگ مجھ کو مسجد کے لیے چندہ کرنے کا ٹھیکہ دے دو۔ میں مسجد کی تعمیر کے لیے سارا پیسہ لاؤں گا، اُس میں پچاس فی صد میرا ہوگا اور پچاس فی صد تمھارا ہوگا۔ اِس طرح کا معاملہ کرکے وہ نکلتے۔ وہ جگہ جگہ مسلمانوں کا اجتماع کرتے۔ وہاں وہ پُر جوش تقریریں کرکے لوگوں کو مسجد کی تعمیر پر ابھارتے۔

حدیث کی مختلف کتابوں میں تعمیر مسجد کے بارے میں ایک روایت آئی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **من بنی للّٰہ مسجداً، بنی اللہ له بیتاً فی الجنة۔** (بحوالہ **مشکاة المصابیح، رقم الحدیث، 697**)، یعنی جس شخص نے اللہ کے لیے ایک مسجد تعمیر کی، اللہ اُس کے لیے جنت میں ایک گھر تعمیر کرے گا۔ وہ اِس حدیث کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے اور پھر جذباتی انداز میں مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہتے — کود جھما جھم جنت میں۔ اِس کے بعد لوگ دل کھول کر مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ دیتے۔

موجودہ زمانے میں خودکش بم باری کے واقعات کثرت سے ہورہے ہیں۔ اِن خبروں کو سُن کر میں نے کہا کہ موجودہ مسلمانوں نے اِس معاملے میں نیا طریقہ نکالا ہے۔ پہلے اگر فارمولا یہ تھا کہ —

کود جھما جھم جنت میں، تو اب لوگوں کا فارمولا یہ ہو گیا ہے کہ — کود جھما جھم دوزخ میں۔

یہ انتہا پسندانہ ذہن مسلمانوں کے اندر کیوں پیدا ہوا۔ اِس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ دشمنی ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے بعض سیاسی اسباب کی بنا پر تمام انسانوں کو اپنا دشمن سمجھ لیا ہے۔ وہ ہر ایک سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ آدمی جب دشمنی اور نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے تو وہ اپنے مفروضہ دشمن کے مقابلے میں اندھے پن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بڑھی ہوئی نفرت کی بنا پر اس کا ذہن یہ ہو جاتا ہے کہ مجھے اِس دشمن کو ہلاک کرنا ہے، خواہ اُس کے نتیجے میں خود میں بھی ہلاک ہو جاؤں۔

یہ وہ نفسیات ہے جس کو قرآن میں شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ قرآن میں شیطان کو انسان کا ازلی دشمن بتایا گیا ہے: **إن الشيطان للإنسان عدوّ مبين** (یوسف: 5)۔ قرآن کے مطابق، اللہ تعالی نے شیطان سے کہا کہ ایسا کرنے کی بنا پر تم کو جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ اِس علم کے باوجود شیطان کی عداوتی سرگرمی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ پوری تاریخ میں انسان کے خلاف شیطان کی یہ دشمنانہ سرگرمیاں مسلسل طور پر جاری رہی ہیں۔ قرآن کے اِس حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمنی کی نفسیات اتنی زیادہ بُری چیز ہے کہ ایسے لوگ ہر حال میں اپنے مفروضہ دشمن کو نقصان پہنچانا چاہیں گے، خواہ اِس کے نتیجے میں خود اُن کو جہنم کی آگ میں ڈھکیل دیا جائے۔

قرآن کا یہ حوالہ اُن لوگوں کے لیے ایک انتباہ ہے جو دوسری قوموں کے خلاف دشمنی اور نفرت میں اتنا زیادہ مغلوب ہو گئے ہیں کہ وہ خودکش بم باری کی حد تک جا کر اُنھیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، حالاں کہ خودکشی کا مطلب حرام موت مرنا ہے، اور حرام موت کا انجام بلاشبہہ جہنم کی آگ ہے۔ جو لوگ اِس بھیانک عمل میں مبتلا ہیں اور جو لوگ اُس کی کھلی مذمت نہیں کرتے، دونوں کو اِس سے ڈرنا چاہیے کہ وہ کہیں اِس خدائی وارننگ کا مصداق نہ بن جائیں: **لأملئن جهنّم منك وممّن تبعك منهم أجمعين** (ص: 85)

دشمنی اور نفرت کے جذبات سے مغلوب ہو کر خودکش بم باری کرنا گویا کہ جان بوجھ کر جہنم کی طرف چھلانگ لگانا ہے۔ یہ بے حد سنگین معاملہ ہے، خودکش بم باری کرنے والوں کے لیے بھی اور جو لوگ اِس پر کھلی نکیر نہ کریں، اُن کے لیے بھی۔

محدودیت میں جینا

دہلی کے ایک صاحب نے بتایا کہ اُن کی بیش تر عمر دہلی میں گزری۔ وہ باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر تھے، پھر ایک بار ان کو یورپ جانے کا موقع ملا۔ وہاں انھوں نے مغربی دنیا کو دیکھا۔ واپسی کے بعد اُن سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اُن سے کہا کہ اپنے سفر کا کوئی تجربہ بتایئے۔ انھوں نے کہا کہ سب سے بڑا تجربہ یہ ہے کہ میں سفر سے پہلے ایک کوکون (cocoon) میں جیتا تھا۔ اپنے محدود خول کے باہر کی دنیا کے بارے میں میری کوئی واقفیت نہ تھی، لیکن اِس سفر کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے محدود خول کے باہر بہت بڑی دنیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ سفر نہ ہوتا تو میں اندھیرے میں جیتا اور اندھیرے میں مرجاتا۔

اِس محدودیت کی دو قسمیں ہیں — ایک، وہ جس کو جغرافی کوکون (geographical cocoon) کہا جاسکتا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جس کو فکری کوکون (intellectual cocoon) کہنا درست ہوگا۔ جغرافی کوکون یہ ہے کہ آدمی جہاں پیدا ہوا ہے، وہیں وہ رہے۔ وہیں کے بارے میں وہ جانے۔ وہیں کے ماحول میں اس کی تربیت ہو۔ ایسا آدمی صرف اپنے محدود وطن کے بارے میں جانے گا۔ لیکن وسیع تر دنیا کے بارے میں وہ بالکل بے خبر رہے گا۔

ذہنی کوکون میں وہ لوگ مبتلا رہتے ہیں جو کسی سبب سے اپنی ذات میں جینے لگیں۔ مثلاً شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے اندر گھمنڈ کا مزاج پیدا ہوجائے۔ وہ اپنی فیملی کو سب سے اونچی فیملی سمجھنے لگیں، اپنی قوم اور اپنی تاریخ کو وہ اپنے لیے فخر کا سرمایہ بنالیں۔ اِس قسم کے لوگ ہمیشہ محدود فکری کی برائی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، اُن کو مختلف ملکوں میں سفر کرنے کا موقع ملے، وہ میڈیا میں نظر آئیں، تب بھی وہ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر اپنے ہی خول میں جئیں گے، وہ بدستور فکری محدودیت کا شکار رہیں گے۔ اُن کی اپنی ذات سے باہر بہت سی چیزیں ہوں گی جس کو وہ اپنے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بنائیں، لیکن کوئی بھی چیز ان کی ذہنی محدودیت کو ختم کرنے والی ثابت نہ ہوگی۔ وہ اپنے فکری خول میں جئیں گے اور اِسی فکری خول کے ساتھ مرکر اِس دنیا سے چلے جائیں گے۔

جدید تہذیب کا بگاڑ

دنیا میں برائی ہر زمانے میں پائی جاتی رہی ہے، مگر موجودہ زمانے میں ایک نئی بات ظاہر ہوئی ہے جو شاید اِس سے پہلے کبھی دنیا میں موجود نہ تھی، وہ ہے برائی کو جائز ٹھہرانے کے لیے اس کو خوب صورت الفاظ میں بیان کرنا۔ اِس کی ایک انتہائی مثال یہ ہے کہ جنسی برائی کو موجودہ زمانے میں ایک نیا لفظ مل گیا ہے، اور وہ سیکس انڈسٹری (sex industry) ہے۔ جنسی برائی کو سیکس انڈسٹری کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی دوسری صنعتوں کی طرح ایک صنعت ہے اور کسی کو حق نہیں کہ وہ اُس پر اعتراض کرے۔

اِس طرح کی ایک مثال نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (11 ستمبر 2008) میں نظر سے گزری۔ اخبار کے صفحہ 24 پر ایک رپورٹ اِس عنوان کے تحت چھپی ہے — ایک لڑکی کا اپنے کنوارے پن کو ریڈیو شو کے ذریعے نیلام کرنا:

Girl to auction virginity on radio show.

ایک 22 سالہ امریکن لڑکی جس کا نام ڈائلن (Natalie Dylan) بتایا گیا ہے، وہ امریکا کی ایک یونی ورسٹی میں اسٹوڈنٹ ہے۔ وہ گریجویشن کر چکی ہے۔ اب اس کو ماسٹر کورس میں داخلہ لینا ہے۔ اِس کورس کی بڑھی ہوئی فیس ادا کرنے کے لیے اس کے پاس رقم نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے کنوارے پن (virginity) کو فروخت کر کے مطلوبہ رقم حاصل کرے اور یونی ورسٹی کے ماسٹر کورس میں داخلہ لے۔ اِس سلسلے میں رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں:

"I don't have a moral dilemma with it. We live in a captalist society. Why should not I be allowed to capitalize on my virginity? I understand, some people may condemn me. But I think, this is empowering. I'm using what I have to better myself," she added.

جدید تہذیب کا یہ مزاج اُس حدیث کا مصداق ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ: **إذا لم تستحي فاصنع ما شئت** (صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء) یعنی جب تمھارے اندر حیا نہ ہو تو تم جو چاہو کرو۔

تاریخِ عالم پر ایک تبصرہ

سیکولر نظریے کے مطابق، دنیا کی تاریخ چار بڑے اَدوار پر مشتمل ہے— بگ بینگ کا واقعہ، مادّی ترقیات، تہذیب کی ترقی، خاتمۂ تاریخ:

Big Bang, material development,
civilizational development, abrupt end.

سیکولر نظریے کے مطابق، تقریباً پندرہ بلین سال پہلے بگ بینگ کے ذریعے موجودہ کائنات کا آغاز ہوا۔ اِس کے بعد لمبے ارتقائی عمل کے ذریعے موجودہ مادّی دنیا بنی۔ انسان کے ظہور کے بعد تہذیبی ترقی شروع ہوئی۔ اکیسویں صدی عیسوی میں گلوبل وارمنگ (global warming) کا ناقابلِ حل مسئلہ سامنے آ گیا۔ اور اب تمام سائنس داں یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری دنیا میں جو طبیعی تغیرات ہو رہے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ 2050 سے پہلے ہی اِس دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔

موجودہ دنیا کی یہ سیکولر تصویر ناقابلِ فہم حد تک عجیب ہے۔ سیکولر نظریہ بتاتا ہے کہ پچھلے پندرہ بلین سال سے ہماری دنیا میں مسلسل طور پر بامعنٰی ارتقا جاری رہا ہے، یہاں تک کہ موجودہ کائنات بنی، جو انتہائی حد تک بامعنی کائنات تھی۔ اب گلوبل وارمنگ کے ذریعے اگر دنیا کسی مزید مستقبل کے بغیر آخری طور پر فنا ہو جائے تو یہ ایک بامعنی آغاز کا ایک بے معنٰی انجام ہوگا، جو بلاشبہہ عقلی طور پر ناقابلِ فہم ہے۔ مثال کے طور پر نظریۂ ارتقا یہ کہتا ہے کہ انواعِ حیات کے درمیان بقائے اصلح (survival of the fittest) کا عمل جاری رہا ہے۔ اِس نظریے کے مطابق، اِسی ارتقائی عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ انسان جیسی ایک اعلیٰ نوع وجود میں آئی۔ اب یہ سرتاسر ایک غیر عقلی (irrational) بات ہے کہ بقائے اصلح کا عمل اپنے آخر میں صرف ایک معکوس انجام پر ختم ہو جائے:

It is unthinkable that the survival of the fittest
may lead to the extinction of the fittest.

خود فطرت کا قانون یہ تقاضا کرتا ہے کہ کائناتی پراسس اپنے آخر میں ایک بہتر دنیا کو وجود میں لانے کا ذریعہ ہے۔

حقیقت پسندی، معیار پسندی

ایک دانش مند نے داخلی حکمت اور خارجی حکمت کو بتاتے ہوئے کہا ہے— دوسروں کے بارے میں جاننا، دانش مندی ہے۔ اور اپنے بارے میں جاننا، ذہنی بیداری:

Knowing others is wisdom; knowing the self is enlightenment.

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کے لیے دو قسم کی تیاری درکار ہوتی ہے، اپنے اعتبار سے اور دوسروں کے اعتبار سے۔ یہ دونوں ہی تیاری یکساں طور پر ضروری ہے۔ کسی ایک میں تیار ہونا اور دوسرے میں تیار نہ ہونا، آدمی کے لیے کافی نہیں۔

دوسروں کے بارے میں دانش مندی یہ ہے کہ آدمی دوسروں سے وہی امید کرے جو باعتبار حقیقت ممکن ہے۔ اِس معاملے میں ضرورت سے زیادہ امید (over expectation) ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں امید قائم کرتے ہوئے، آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے جذبات کو پوری طرح الگ رکھے اور صرف امرِ واقعہ کی بنیاد پر امید قائم کرے۔

جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے، اِس معاملے میں آدمی کو چاہیے کہ وہ آخری امکان تک جائے۔ وہ آخری حد تک اپنے آپ کو دریافت کرے، وہ آخری حد تک اپنے آپ کو استعمال کرنے کی کوشش کرے، دوسروں کے معاملے میں حقیقت پسندی (realism) مطلوب ہے، اور اپنے معاملے میں معیار پسندی (idealism)۔

ایک صاحب کو مشورہ دیتے ہوئے میں نے کہا— اپنے گھر کے اندر آپ آئیڈیلسٹ (idealist) بنئے، اور گھر سے باہر نکلتے ہی پریکٹکل (practical) بن جایئے۔

اِن دوطرفہ تقاضوں کو نبھانا، ایک مشکل کام ہے۔ اِس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اِن دوطرفہ تقاضوں کو نبھائیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے معاملے میں حقیقت پسند (realist) ہو اور اپنے معاملے میں معیار پسند (idealist)۔ جس آدمی کے اندر اِس کے برعکس مزاج ہو، وہ اِس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

چُپ کی طاقت

ایک پرانا مثل ہے—ایک چُپ ہزار بلا ٹالتی ہے۔ یہ مثل تقریباً ہر زبان میں مختلف الفاظ میں موجود ہے۔ اِس لحاظ سے تمام لوگ اِس مثل کو جانتے ہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اِس مثل کو عملاً اپنی زندگی میں استعمال کریں۔ جاننے میں اور عمل میں اِس فرق کا سبب کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب کوئی عورت یا مرد اِس مثل کو سنتا ہے یا پڑھتا ہے، اُس وقت وہ معتدل ذہن (normal mind) کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن جب اُس کے استعمال کا وقت آتا ہے تو اُس وقت وہ غیر معتدل ذہن (abnormal mind) کی حالت میں ہو جاتا ہے۔ اِس کے عملی استعمال کا وقت وہ ہوتا ہے، جب کہ کوئی آدمی بھڑ کا کر اُس کو غصہ دلا دے، وہ اس کے خلاف نازیبا کلمات بول دے۔ اُس وقت یہ ہوتا ہے کہ سننے والا بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتا ہے۔ یہی سبب ہے جس کی بنا پر لوگ جانتے ہوئے بھی چپ کی پالیسی کو اختیار نہیں کر پاتے۔ چپ رہنے سے بات وہیں کی وہیں ختم ہو سکتی تھی، لیکن بولنے کا طریقہ اختیار کرنے کی وجہ سے بات بڑھتی ہے اور بریک ڈاؤن (break down) کی نوبت آجاتی ہے، ایک وقتی چیز مستقل خرابی کا سبب بن جاتی ہے۔

اشتعال کے موقع پر چپ رہنا سب سے زیادہ کامیاب پالیسی ہے۔ اشتعال کے موقع پر نہ بولنا فتنے کے دروازے کو بند کر دیتا ہے، اور اشتعال کے موقع پر بولنا فتنے کا دروازہ کھول دیتا ہے، ایسا دروازہ جو پھر کبھی بند نہیں ہوتا۔ اشتعال کے موقع پر بولنے سے بات بڑھتی ہے، اور اشتعال کے موقع پر نہ بولنے سے بات وہیں کی وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ اِسی حقیقت کو حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **الفتنة نائمةٌ لعن الله مَن أيقظها (كنز العُمّال، رقم الحديث: 30891)** یعنی فتنہ سویا ہوا ہے، اُس شخص پر لعنت ہے جو اِس سوئے ہوئے فتنے کو جگائے۔ ہر آدمی اپنے اندر منفی نفسیات لیے ہوئے ہے۔ اگر آپ چپ رہیں تو یہ منفی نفسیات دبی رہے گی۔ لیکن اگر آپ بول دیں تو یہ منفی نفسیات جاگ اٹھے گی اور پھر اس کے وہ برے نتائج نکلیں گے جس کا پیشگی اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اخراجات کو گھٹائیے

ایک صاحب جو بزنس کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ موجودہ آمدنی (income) سے میرا کام نہیں چلتا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ بینک سے قرض (loan) لے کر اپنے کاروبار کو بڑھاؤں۔ اِس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ اِس وقت آپ اپنی آمدنی بڑھانے کے ذہن سے سوچ رہے ہیں۔ اِس کے بجائے، آپ اپنے خرچ کو گھٹانے کی بات سوچیے۔ کیوں کہ خرچ کو گھٹانا بھی آمدنی کو بڑھانا ہے۔ آپ یہ کیجیے کہ آپ اپنے گھر کے اخراجات کو گھٹائیے۔ اِس طرح، آپ اپنی موجودہ آمدنی ہی میں اپنے گھر کو چلانے کے قابل ہو جائیں گے۔

ایک طرف آپ یہ کریں اور دوسری طرف، آپ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اپنے کاروبار کو بڑھائیں۔ جلد ہی آپ محسوس کریں گے کہ جو مقصد آپ بینک کے قرض کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ بینک کے قرض کے بغیر حاصل ہو گیا ہے۔ اِسی طریقے کا نام منصوبہ بند انداز میں کام کرنا ہے۔ منصوبہ بند انداز میں کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایک طرف، اپنے موجود ذرائع کو دیکھے۔ اور جب بھی وہ کوئی نیا اقدام کرے تو وہ نتیجے کو دیکھ کر کرے، نہ کہ صرف اپنے شوق کو دیکھ کر۔ منصوبہ بندی (planning) دراصل ذرائع اور امکان کے درمیان تناسب تلاش کرنے کا نام ہے، نہ کہ ذرائع کا لحاظ کیے بغیر محض شوق کے تحت چھلانگ لگانے کا نام۔

اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا لحاظ کیے بغیر اپنے خرچ کو بڑھاتے رہتے ہیں۔ اِس بنا پر وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔ کبھی قرض لیتے ہیں، کبھی کوئی بے اصولی کا کام کرتے ہیں، کبھی غلط طریقے سے کمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں تباہ کن ہیں۔ اگر آپ سادہ زندگی اختیار کریں، اپنے اخراجات کو محدود رکھیں، ضرورت کے مطابق خرچ کریں، نہ کہ شوق اور نمائش کے لیے خرچ کرنے لگیں — جو شخص اِن باتوں کا لحاظ رکھے گا، وہ کبھی غیر ضروری پریشانی کا شکار نہیں ہوگا۔ اُس کے مسائل فطری مسائل ہوں گے، نہ کہ غیر فطری مسائل۔

مسئلے کا یقینی حل

حیدرآباد کے ایک مسلم تاجر نے بتایا کہ ایک صاحب سے ان کی پارٹنرشپ تھی۔ کچھ عرصہ بعد دونوں کے درمیان شکایتیں پیدا ہوئیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ پارٹنرشپ اب چل نہیں سکتی۔ مذکورہ مسلم تاجر نے اپنے پارٹنر سے کہا کہ میری رائے ہے کہ اب یہ پارٹنرشپ ختم کردی جائے۔ آپ الگ اپنا کام کریں اور میں الگ اپنا کام کروں۔ پارٹنر نے پوچھا کہ اُس کا طریقہ کیا ہوگا۔ مسلم تاجر نے کہا کہ اِس کا طریقہ بہت آسان ہے۔ اِس معاملے کا پورا اختیار میں آپ کو دیتا ہوں۔ میری طرف سے کوئی شرط نہیں ہے۔ آپ جس طرح چاہیں، کاروبار کو دونوں کے درمیان تقسیم کردیں۔ جو چاہیں آپ لے لیں، اور جو چاہیں مجھ کو دے دیں۔ پارٹنر نے کہا کہ میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ مجھ کو دو دن سوچنے کا موقع دیجیے۔ اس کے بعد میں آپ کو اپنی رائے بتاؤں گا۔ دو دن کے بعد پارٹنر نے مذکورہ تاجر سے ملاقات کی۔ اُس نے کہا کہ غور کرنے کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ سے اچھا کوئی اور شریکِ تجارت مجھے نہیں مل سکتا۔ اِس لیے میں اپنے اختلاف کو یک طرفہ طور پر ختم کرتا ہوں۔ میں آپ کو پورا حق دیتا ہوں کہ آپ جس طرح چاہیں، کاروبار کو چلائیں۔ ہماری اور آپ کی پارٹنرشپ اِسی طرح باقی رہے گی اور جہاں تک اختیار کا تعلق ہے، آپ کو ہر قسم کے فیصلے کا اختیار حاصل رہے گا۔

مذکورہ مسلم تاجر ماہ نامہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اِس واقعے کو کئی سال ہو چکے ہیں اور ہماری پارٹنرشپ نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان نہ کوئی شکایت ہے اور نہ کوئی بدگمانی۔ اِس فیصلے کے بعد کاروبار میں کئی گنا زیادہ ترقی ہوئی ہے اور دونوں پارٹنر پہلے سے زیادہ خوش ہیں — نزاعی معاملے کو ختم کرنے کا یہی سب سے اچھا طریقہ ہے۔ نزاع کے وقت جب ایک شخص یک طرفہ طور پر پیچھے ہٹ جائے تو وہ فریقِ ثانی کے اندر معقولیت کو جگا دیتا ہے۔ وہ فریقِ ثانی کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کردیتا ہے۔ اور جب طرفین کے درمیان معقولیت اور حقیقت پسندی کی فضا قائم ہوجائے تو مسئلہ اِس طرح ختم ہوجاتا ہے، جیسے کہ اُس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

سوال وجواب

سوال

میں تدریسی پیشے سے منسلک ہوں اور الحمد للہ دین کی سمجھ بنیادی طور پر رکھتا ہوں۔ میری پریشانی یہ ہے کہ کبھی تو دل میں ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کو دین سے قریب کرنے کی کوشش کروں، لیکن پھر قوم کی بے رخی اور ان کو برائی کے دلدل میں پھنسا ہوا دیکھتا ہوں اور ان کی بہانہ بازی دیکھتا ہوں تو پھر ان سے بات تک نہ کرنے اور کوئی کام نہ کرنے کی بات دل میں آجاتی ہے۔ مہربانی فرما کر اپنے مشورے سے مجھے نوازیں کہ میں اپنوں کے درمیان اصلاح کا کام کس طرح کروں۔

چوں کہ میں سرکاری ملازم ہوں اس لیے غیر مسلم اساتذہ سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ کچھ مذہب کے متعلق خیالات کا تبادلہ بھی ہوتا ہے، لیکن میرے پاس کوئی لٹریچر ان حضرات کو اسلام کی معلومات دینے والا نہیں ہے۔ اگر آپ کچھ ارسال کرسکیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ میں منتظر ہوں کہ آپ میری رہ نمائی فرمائیں (غلام فرید، ایوت محل، مہاراشٹر)۔

جواب

دعوت واصلاح کا کام ایک ذمّے داری ہے۔ وہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں کیا جاتا ہے۔ اہلِ ایمان کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ پیغمبر کے ذریعے ملے ہوئے خدائی پیغام کو اُس کے بندوں تک پہنچائیں۔ اِس معاملے میں نتیجہ (result) کا پہلو ایک اضافی (relative) پہلو ہے۔ دعوت واصلاح کے عمل کا مطلوب نتیجہ نکلے یا نہ نکلے، ہر حال میں دعوت واصلاح کا کام جاری رکھنا ہے، اُس وقت تک جب تک کہ موت نہ آجائے۔

دعوت واصلاح کا کام صرف مدعو کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ وہ خود داعی کے اعتبار سے ہے۔ دعوت واصلاح کے کام میں ہمیشہ مختلف قسم کے تجربات ہوتے ہیں۔ یہ تجربات داعی کی شخصیت کی تعمیر کے لیے انتہائی حد تک اہم ہیں۔ اِن تجربات کے بغیر داعی کے اندر مطلوب شخصیت نہیں بن سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مدعو کی طرف سے مثبت جواب (positive response) نہ ملے، تب بھی دعوتی عمل

کا یہ فائدہ بہر حال حاصل ہوتا ہے کہ داعی کی اپنی شخصیت مسلسل طور پر ترقی کا سفر طے کرتی رہتی ہے، آپ قرآن کو اِس پہلو سے پڑھیں تو آپ واضح طور پر اِس حقیقت کو دریافت کرلیں گے۔

سوال

میں نے پہلا خط آپ کی جانب لکھا تھا۔ اس کا جواب مجھے 'الرسالہ' میں مل گیا۔ اُمید ہے کہ آپ آگے بھی ہماری رہ نمائی فرمائیں گے۔ حال ہی میں ایک درسگاہ میں ایک اجتماع کا انعقاد ہوا جو ہمارے پاس ہی واقع ہے۔ مجھے اللہ نے وہاں جانے کی توفیق عطا فرمائی۔ وہاں ایک مقرر نے جو مدینہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں، آپ کی ایک کتاب کا حوالہ دے کر لوگوں کو بہت سی باتوں سے واقف کرایا۔ میں بہت متاثر ہوا۔ جب بھی کسی سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے تو اکثر آپ کی کتابوں کو پڑھنے کا مشورہ دیتا رہتا ہوں۔ میری دلی تمنّا ہے کہ دنیا بھر میں امن وامان قائم ہو اور ہمارے علماء آپ کی طرح سوچنے لگیں اور دین کی اصل صورت لوگوں تک پہنچائیں۔ لوگوں میں جو ذہن پیدا ہوا ہے، وہ ہمارے علماء ہی کی دین ہے۔ ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ ہمارے دلوں میں علماء کا احترام ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہماری سوچ بھی ویسی ہو جاتی ہے۔

چند دن پہلے میں اپنے ایک دوست سے بات کر رہا تھا تو جواب میں وہ بولنے لگے کہ آپ نے بات اچھی کی، لیکن آپ دین کے معاملے میں زیادہ ڈیپ (deep) ہو رہے ہیں اور اگر آگے بھی ایسا چلتا رہا تو اللہ ہی آپ کا نگہبان ہے۔ آپ کو ایک رہبر کی ضرورت ہے۔ میں سمجھ گیا کہ رہبر سے ان کی مراد کیا ہے کیوں کہ یہاں پر عام لوگوں کا یہی عقیدہ ہے۔ میں بات کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا ہوں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ خط کے ذریعے یا کتاب کے ذریعے میرے اندر ایک زندہ شعور پیدا ہو۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور آپ کی تحریروں میں اثر دے اور ہمارے دلوں میں خلوص دے تاکہ ہم جو پڑھیں یا سنیں، وہ ہمارے دلوں میں اتر جائے (شکیل احمد ملک، سری نگر، کشمیر)۔

جواب

آپ کے ساتھی کا یہ کہنا کہ آپ دین کے معاملے میں زیادہ ''ڈیپ'' میں کیوں جا رہے ہیں،

کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک نہایت خطرناک بھول ہے جس میں موجودہ زمانے کے بیش تر مسلمان مبتلا ہیں۔ آج کل اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی دنیوی ترقی کے معاملے میں تو ''ڈیپ'' میں جاتے ہیں، لیکن آخرت کے معاملے میں وہ صرف کچھ رسمی اعمال کو کافی سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک دہرا معیار ہے۔ اِسی دہرا معیار کا دوسرا نام منافقت ہے، اور منافقت کسی آدمی کو خدا کے غضب کا مستحق بناتی ہے، نہ کہ خدا کی رحمت کا مستحق۔

اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح بات یہ ہے کہ آدمی اپنی دنیا کے معاملے میں سادگی پر قانع ہو۔ وہ صرف ضروری حد تک اپنے آپ کو دنیا کی چیزوں میں مشغول کرے۔ اِس کے بعد جہاں تک دین کا اور آخرت کا معاملہ ہے، وہ اُس میں پوری طرح ڈیپ میں جائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ گہرائی کے ساتھ دین اور آخرت کے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اِس کے بغیر کسی کو آخرت کی جنت ملنے والی نہیں۔

جنت کی قیمت کچھ رسمی اعمال نہیں ہیں۔ جنت میں صرف وہ انسان داخل کیا جائے گا جس نے اپنا تزکیہ کیا ہو۔ تزکیہ کوئی پُراسرار چیز نہیں۔ تزکیہ ذہنی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ آدمی جب خدا کی کتاب کو تدبر کے ساتھ پڑھتا ہے، وہ جب اپنا محاسبہ کرتا ہے، وہ خشوع والی عبادت انجام دیتا ہے، وہ خدا رخی زندگی (God-oriented life) اختیار کرتا ہے تو اس کے اندر ایک مزکّی شخصیت (purified personlity) بنتی ہے۔ یہی مزکّی انسان وہ انسان ہے جس کو آخرت میں جنت کے باغوں میں داخل کیا جائے گا۔ امانی یا خوش فہمی (wishful-thinking) کے ذریعے کسی کو جنت ملنے والی نہیں۔

سوال

انسان نے اپنی تاریخ کے روزِ اول سے ہی رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے مذہب، خدا اور دیوی دیوتاؤں کے نام پر معصوم جانوروں کا بے رحمانہ قتل (قربانی) کارِ ثواب تصور کرلیا تھا جس کے باعث ان بے زبان و بے قصور حیوانات کا بے دریغ قتل (قربانی) ایک عوامی روایت بن گئی تھی۔ ان حالات میں خدا کی اس بے زبان مخلوق کے اس بے رحمانہ قتل کے خلاف بھگوان مہاویر اور راج کمار

سدھارتھ (گوتم بدھ) نے ایک درد بھری آواز اٹھائی۔ انھوں نے انسان کی روح کو یہ بھی احساس کرایا تھا کہ خدا کی اس غیر انسانی مخلوق میں بھی انسان کی طرح ہی روح وجان اور جذبۂ احساس موجود ہے اوران کے قتل کے وقت انھیں بھی انسان کی طرح تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ مہابیر سوامی نے تو اہنسا کو ہی سب سے مقدس روحانیت قرار دیا ہے۔ مہارشی دیانند سرسوتی نے ہندو دھرم کے گرنتھوں میں موجود بلی پرتھا (رسم قربانی) کو وید، مذہب اور روحانیت کے خلاف اور قابل ترک ثابت کیا ہے۔ اس سب کے نتیجے میں بلی پرتھا (رسم قربانی) آج ہندو فرقوں میں اپنے آخر پر ہے۔ لیکن مسلم سماج میں آج بھی جانور کی قربانی کو مذہبی فرض مانا جاتا ہے۔ خصوصاً عیدالاضحیٰ کے موقع پر عید قرباں منائی جاتی ہے۔ اس میں بے زبان ومعصوم جانوروں کو بڑی بے دردی و بے رحمی سے قتل کیا جاتا ہے۔ براہِ کرم، اس معاملے کی وضاحت فرمائیں (رنگی لال آریہ (ایڈوکیٹ)، سہارن پور)۔

جواب

آپ نے ''قتلِ حیوان'' کے حوالے سے گوتم بدھ اور مہابیر کی جس تعلیم کا ذکر کیا ہے اور اُس کے مقابلے میں اسلام پر جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ دراصل غیر سائنسی دور اور سائنسی دور کے درمیان فرق کا معاملہ ہے۔ سائنسی دور سے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ قتل کا لفظ تو صرف حیوان اور انسان سے تعلق رکھتا ہے، اور جہاں تک دوسری چیزوں کا تعلق ہے، اُن پر قتل کا لفظ چسپاں نہیں ہوتا۔ مگر موجودہ زمانے میں سائنسی تحقیقات نے بتایا ہے کہ حیوان اور انسان کے علاوہ، دوسری چیزوں میں بھی زندگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً پانی اور دودھ اور سبزی اور پھل، وغیرہ۔ اِس لحاظ سے دیکھئے تو موجودہ سائنسی زمانے میں گوتم بدھ اور مہابیر کی تعلیمات غیر متعلق (irrelevant) ہو چکی ہیں۔ آج اگر گوتم بدھ اور مہابیر زندہ ہوتے اور وہ خوردبین (microscope) کے ذریعے پانی اور دودھ اور سبزی اور پھل کو دیکھتے تو بلاشبہہ وہ اعلان کر دیتے کہ ہم غلطی پر تھے۔ سائنسی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ وہی بات درست ہے جو بہت پہلے اسلام میں بتائی گئی تھی۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — 192

1- سائی انٹرنیشنل سنٹر (لودھی روڈ، نئی دہلی) میں 15 اکتوبر 2008 کو ایک پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام انڈیا کے مختلف کیندریہ ودّیالیہ کے پرنسپل حضرات کے لیے تھا۔ اِس کا عنوان یہ تھا:

Basic Human Values in Islam.

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ عنوان پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ اِس موقع پر سی پی ایس کی ٹیم کے افراد بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے حاضرین کو مطالعے کے لیے دعوتی لٹریچر دیا۔

2- نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی جانب سے گڑگاؤں ہریانہ میں 19-11 اکتوبر 2008 کو ایک بک فیئر لگایا گیا۔ یہ بک فیئر گڑگاؤں کے فائیو اسٹار ہوٹل کراؤن پلازہ (The Crown Plaza) کے لان میں لگایا گیا تھا۔ اِس بک فیئر میں گڈورڈ بکس (نئی دہلی) نے بھی حصہ لیا۔ یہ بک فیئر دعوتی اعتبار سے بہت کامیاب رہا۔ بڑی تعداد میں غیر مسلموں سے اسلام کے موضوع پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ اور انٹرایکشن کے درمیان ان کو دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ (شاہ عمران حسن)

3- رام لیلا گراؤنڈ (دہلی) کے وسیع میدان میں 19-17 اکتوبر 2008 کو اسلام اور دہشت گردی کے موضوع پر ایک سہ روزہ کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس جمعیت اہلِ حدیث کی طرف سے کی گئی تھی۔ اِس موقع پر رام لیلا گراؤنڈ میں صدر اسلامی مرکز کی مطبوعات اور سی ڈیز پر مشتمل ایک بک اسٹال لگایا گیا۔ لوگوں نے بڑے پیمانے پر وہاں سے اسلامی لٹریچر حاصل کیا۔ سی پی ایس کے ممبران نے کانفرنس کے دوران اردو انگریزی زبان میں دعوتی لٹریچر (پمفلٹس، بروشر) مفت تقسیم کیے۔ لوگوں نے اس کو بہت شوق سے لیا۔ لوگوں کی دل چسپی کا حال یہ تھا کہ پہلے ہی مرحلے میں پمفلٹس کا ایک بڑا کارٹن ختم ہوگیا۔ لوگ اسٹال پر آکر مزید پمفلٹس حاصل کر رہے تھے۔

4- تل ابیب (Tel Aviv) میں قیامِ امن کے لیے ایک ادارہ قائم ہے۔ اِس ادارے کا نام پیریز سنٹر فار پیس (Peres Centre for Peace) ہے۔ اُس کے بانی مسٹر شمعون پیریز ہیں۔ اِس ادارے کے تحت، تل ابیب میں ایک انٹرنیشنل پیس کانفرنس ہوئی۔ اِس میں تقریباً 50 ملکوں کے ممتاز افراد شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس 29-27 اکتوبر 2008 کو ہوئی۔ اِس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اُن کے ساتھ سی پی ایس انٹرنیشنل کی ٹیم کے مزید 6 افراد تل ابیب گئے۔ انھوں نے حاضرین کو مطالعے کے لیے دعوتی لٹریچر، خاص طور پر، قرآن کا نیا انگریزی ترجمہ بڑے پیمانے پر دیا۔ صدر اسلامی مرکز نے اِس کانفرنس میں ''امن اور اسلام'' کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اِس کے علاوہ انھوں نے ڈسکشن میں بھی شرکت کی۔ کانفرنس کے بعد انھوں نے مسجدِ اقصیٰ اور بیت المقدس کا سفر کیا۔ اِس سفر کی تفصیلی روداد ان شاء اللہ سفرنامے کے تحت الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

5- پی ٹی آئی (نئی دہلی) کے نمائندہ سبھاش کمار یادو نے 23 اکتوبر 2008 کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع یہ تھا کہ disarmament کیسے ہو۔ بتایا گیا کہ اس معاملے میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسٹیٹ کے سوا کسی اور ایجنسی کو ہتھیار اٹھانے کا حق نہیں۔

6- ایک خط: ''میں الرسالہ کا مطالعہ 1988 سے کر رہا ہوں۔ الرسالہ کے مطالعہ سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ میرے علم میں اضافہ ہوا۔ الرسالہ کا مطالعہ میرے لیے روحانی غذا بن گیا۔ میں الرسالہ خود بھی پڑھتا ہوں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کے لیے دیتا ہوں۔ میں نے محکمہ تعلیم میں بطور مدرس گورنمنٹ سروس کی ہے۔ پانچ سال پہلے سروس سے سبک دوش ہو چکا ہوں۔ جب میں ہائی اسکول میں تھا، اسکول کا تمام اسٹاف، مسلم غیر مسلم، بڑے شوق سے الرسالہ کا مطالعہ کرتا تھا۔ میں نے چاہا کہ الرسالہ خاص و عام تک پہنچاؤں۔ گزشتہ سال اسلامی مرکز میں ایک سال کا زرِتعاون ارسال کر کے بیس افراد کے نام میں نے الرسالہ جاری کرایا ہے جس کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔ اِس سال اِن بیس افراد نے خود ہی زرِتعاون اسلامی مرکز میں ارسال کر کے الرسالہ جاری کرایا۔ اِس سال میں نے بیس گورنمنٹ ادارے جن میں کالج، ہائر سکنڈری اسکول اور ہائی اسکول، مختلف اضلاع سے منتخب کیے۔ ایک سال کا زرِتعاون اسلامی مرکز میں ارسال کر کے اِن اداروں میں الرسالہ جاری کرایا۔ میں الرسالہ سے تقریباً بیس سال سے جڑا ہوں۔ آپ سے حوصلہ افزائی چاہتا ہوں۔ ان شاء اللہ آئندہ بھی دین کا کام کرتا رہوں گا۔ اللہ آپ کی عمر طویل کرے'' (حاجی عبد القیوم، جموں و کشمیر، 22 اکتوبر 2008)۔

7. I was very impressed with your monthly Al-Risala. Your knowledge helped me very much in understanding various facts of life. I want to read your literature more and more. I like to read only those books which contain both Islamic and scientific knowledge. I have found all the things which I like to read in your book. (Tariq Ahmad, Kashmir)

8. I am delighted and overwhelmed to find Al Risala on line, as I am living outside India. After a long time I got the opportunity to read wonderful "Tazkeer" in a very lucid manner, in a straight forward language which goes direct to the heart, of course, without bypassing the brain. The best thing is the statements are supported by Quran and Hadeeth, which gives the feeling of authenticity on the topic. May Allah grant Maulana great reward for such a noble deed. (Dr. Saif, KSA)

8. Now since almost all of written material by Maulana Wahiduddin Khan is online. For example, Al Risala, books & booklets (Urdu, English and Arabic), Audio lectures and Tazkirul Quran, What you have to do is give your friends and relatives the website address www.alrisala.org . If anyone doesn't

have internet facility at home he can go to a library and read the material. What you and your friends can do is, print out some of the articles from website and gather in a mosque or any other place and read them out and discuss. Also one of you can download Maulana's lectures and download it on an audio CD and gather at one place to listen and discuss. You can continue doing this for months and years. There is enough material on the Web. Also you can download and print the new Al-Risala monthly (Urdu) or the new Spiritual Message monthly magazine in English every month and study and discuss. (Khaja Kaleemuddin, Al Risala Forum International, USA)

10- نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی جانب سے بہار کی راجدھانی پٹنہ میں 32واں نیشنل بک فیئر 16-8 نومبر 2008 منعقد کیا گیا۔ اِس میں گڈ ورڈ بکس (نئی دہلی) نے بھی حصہ لیا۔ لوگوں نے یہاں سے صدر اسلامی مرکز کی کتابیں بڑی تعداد میں حاصل کیں۔ یہ بک فیئر بہت کامیاب رہا۔ کافی لوگوں سے انٹرایکشن کرنے کا موقع ملا۔ اِس طرح بہت سارے لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ لوگوں کو مفت میں ادارے کی طرف سے کتابیں دی گئیں۔ نیز نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے ڈپٹی ڈائرکٹر مسٹر وجے پال کو صدر اسلامی مرکز کا ہندی ترجمہ قرآن ''پوتر قرآن'' تحفتاً دیا گیا۔ انھوں نے اس کو خوشی کے ساتھ لیا۔ (شاہ عمران حسن)

11 - مشہور انگریزی اخبار لیمان (Le Monde Diplomatique) کی نمائندہ وِنڈے (Wendy Kristianasen) مقیم لندن 12 نومبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کے دفتر میں آئیں۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع تھا— ہندستانی مسلمان۔ اِس گفتگو کے تحت ان کو ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں تفصیلی معلومات دی گئیں۔ آخر میں ان کو مندرجہ ذیل کتاب برائے مطالعہ دی گئی:

Indian Muslims: A Positivie Outlook

12- ای ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے 12 نومبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس انٹرویو کا موضوع حج کا پیغام تھا۔ اِس سلسلے میں قرآن (البقرۃ: 197) کی روشنی میں حج کے اجتماعی فوائد بتائے گئے۔

13- دوردرشن (اُردو) کی ٹیم نے 28 نومبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس کا موضوع بمبئی پر دہشت گردوں کا حملہ (26 نومبر 2008) تھا۔ اِس واقعے کی سخت مذمت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا کہ جو لوگ اِس قسم کا تشدد کرتے ہیں، وہ امن کی طاقت سے بے خبر ہیں۔ تشدد کے ذریعے کبھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا۔ ایک سوال یہ تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ ظلم کا نظریہ بالکل غلط ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کو ہر قسم کے مواقع حاصل ہیں۔ پُر امن طور پر وہ وہاں ہر قسم کی ترقی کر سکتے ہیں۔